یکے از مطبوعاتِ مجلس ترقی ادب لاہور

حکمتِ قرآن

جرنیل محمود مختار پاشا مرحوم

کی تصنیف

حکمتِ قرآن کے مقدمے کا اردو ترجمہ

از

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

مجلسِ ترقیٔ ادب نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

یکے از مطبوعات مجلس ترقیٔ ادب لاہور

حکمتِ قرآن

جرنیل محمود مختار پاشا مرحوم

کی تصنیف

حکمتِ قرآن کے مقدمے کا اردو ترجمہ

از

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

مجلس ترقیٔ ادب
نرسنگھ داس گارڈن - کلب روڈ
لاہور

ناشر :

کریم احمد خان

معتمد ـ مجلس ترقیٔ ادب ـ لاہور

مطبع :

کاروان پریس ـ ایبک روڈ ـ انار کلی ـ لاہور

حکمت قرآن

جرنیل محمود مختار پاشا

کی تصنیف

حکمت قرآن کے مقدمے کا اردو ترجمہ

از

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم اے - بی ای ایس
سابق صدر شعبۂ فارسی و اردو - گورنمنٹ کالج ، لاہور

به اجازت و شکریه

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

لندن

پیش لفظ

یہ چھوٹا سا رسالہ مشہور ترکی جرنیل محمود مختار مرحوم کی ایک تالیف "Wisdom of the Quran" کے مقدمے کا ترجمہ ہے۔ جرنیل مرحوم نے اپنی کتاب میں قرآن مجید کی ایسی آیات کا انتخاب کیا ہے جس میں بالخصوص اسلام کے اخلاق ، دینی اور معاشی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے شروع میں انہوں نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے اور اس میں انہوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلام کے اخلاقی نظام پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ابتدائے ظہور اسلام سے لے کر موجودہ دور تک اس کے مختلف ارتقائی ادوار پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اسلامی نظام فکر محض ذہنی طور پر ہی جاذب توجہ نہیں بلکہ عملی طور پر بھی ایک مکمل اور جامع شے ہے جس میں افراد و اقوام کی زندگی کے لیے ایک صحیح اور صحت مند لائحہ عمل موجود ہے۔ اس نظام فکر و عمل کے مقابلے میں دنیا ابھی تک اور کوئی نظام پیش نہیں کر سکی اور اگر اس بارے میں دیکھنے والوں کو بظاہر کوئی قابل اعتراض چیز نظر آتی ہے تو وہ عمل نہ کرنے والوں کی اپنی کوتاہی ہے اور بس۔

محمود مختار مرحوم ، ٹرکی کے ایک معروف علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد بزرگوار جرنیل احمد مختار کا نام عسکری اور علمی خدمات کے باعث اسلامی دنیا میں بہت مشہور ہے ایسے ہی بزرگوں کے متعلق عرفی نے کہا تھا۔

اے داشتہ در سایۂ ہم تیغ و قلم را

یہ خاندان تلوار کا دھنی بھی تھا اور اشہب قلم کا شاہسوار بھی ۔ ان کی ذہنی اور عملی زندگی ایک صالح اور صحت مند قسم کے اسلامی کردار کا نمونہ تھی ۔ ان کے علمی اور ادبی مشاغل میں دینی علوم کا گہرا اور عمیق مطالعہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے اور چونکہ وہ اسلامی تصوف سے خاص شغف رکھتے تھے ، اس لیے ان کے مطالعے اور تحریروں میں تصوف کا رنگ غالب ہوتا تھا ۔ چنانچہ محمود مختار مرحوم کی اس تالیف میں بھی یہ رنگ بہت نمایاں نظر آئے گا ۔

فاضل مصنف نے قرآنی آیات کے انتخاب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا تھا ۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اہلیۂ محترمہ کے ایما پر ان کے ایک عقیدت مند ، ڈاکٹر جان نکیش ایم ۔ اے ۔ ڈی ۔ ڈی نے اسے انگریزی زبان کا جامہ پہنایا ۔

قرآنی آیات کے انتخابات ، اس کے فرانسیسی اور انگریزی ترجمے کے پیش کرنے کی غرض و غایت کیا تھی ؟ بہتر ہوگا کہ میں یہاں فاضل مصنف کے مختصر سے دیباچے کے وہ اقتباسات درج کر دوں جن میں انہوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے ۔

> ''دوسرے مذاہب کی طرح اسلام کا ظہور بھی آہستہ آہستہ اور بالتدریج ہوا اور دشوار کٹھن منزلوں سے گزرتا رہا ۔ اس کے گرد مکار دشمنوں کا نرغہ تھا اس کے ابتدائی قدم ، خطرناک حریفوں کی کمینگاہوں پر پڑے ۔ اس کے آگے بڑھنے پر دشمنوں کے شکوک اور حقارت و عداوت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا ۔ جب یہ بلوغت کو پہنچا اور اس کے قدم مستحکم ہوئے تو اسے اپنی مدافعت اور بچاؤ کے لیے پیہم تدارک کی ضرورت پڑی اور اپنے حریفوں کے اقدامات کی روک تھام کے لیے جنہیں وہ حق و صداقت کے منافی سمجھتا تھا ان کا مقابلہ بھی کرنا پڑا ۔ ان تمام واقعات کا عکس قرآن پاک میں موجود ہے ....
> اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ابدی حقائق بھی ہیں جو قرآنی تعلیمات میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں ۔''

’’قرآن پر غور کرنے کے بعد ہم نے صرف ان آیات کو انتخاب کر لیا ہے جو ہماری رائے میں اسلامی تعلیمات کی روح رواں ہیں اور اگر قارئین کو کہیں کہیں تکرار مطالب کی صورت نظر آتی ہے جو کتاب پاک کا مابہ الامتیاز ہے تو یہ چیز بھی فائدہ سے خالی نہیں کیونکہ اس سے نہ صرف اصل ماخذ یعنی قرآن مجید کی ترتیب بحال رہتی ہے بلکہ مختلف آیات کا باہمی ربط بھی استوار تر نظر آتا ہے۔ مزید برآں اس تکرار سے بعض اہم مسائل کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔‘‘

’’قرآن پاک اپنے اصلی لباس میں نہایت دیدہ زیب ہے اور اس کا اپنا ایک دلفریب حسن ہے۔ اس کے اسلوب بیان کا اختصار اور شکوہ، اس کے چھوٹے چھوٹے فقروں کی جامعیت اور بلاغت، جگہ جگہ مقفیٰ عبارت ان سب میں وہ بیانی قوت اور شدید زور کلام ہے کہ جسے کسی صورت میں بھی لفظی ترجمے کے ذریعے بحال نہیں رکھا جا سکتا‘‘

’’قرآن پاک کے تراجم بعض اجنبی زبانوں میں مختلف اوقات میں ہو چکے ہیں۔ ان تراجم کی کثرت خود اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی مرحلے پر بھی کسی ایک ترجمے کا جامع اور مکمل ہونا محال[1] ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ہر نئی کوشش اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی ایسا ترجمہ کیا جائے جو اصل کی روح کے قریب تر ہو‘‘

’’کسی مقدس تحریر کے ترجمے میں علاوہ زبان کے اور بھی کئی دقتیں ہوتی ہیں۔ فقط دونوں زبانوں کا علم مترجم کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ اگر مقدس متن کو نئی زبان میں نئی زندگی عطا کرنا ہو تو اس کے لیے مترجم کا خود اصل کتاب سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ قرآن مجید کے مختلف تراجم میں غالباً سب سے بڑی

کمزوری یہی رہی ھے کہ فقط لغوی پہلوؤں کو حد
سے زیادہ ملحوظ رکھا گیا ۔ اس لیے ہم نے اپنے ترجمے
میں زیادہ تر مفہوم و مطالب کو اھمیت دی ھے
تاکہ قرآن پاک کی روح فکر نمایاں ہو جائے۔"

ان عبارتوں سے آپ کو مصنف کے مقاصد کا پتا چل گیا ہوگا ۔ جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا یہ رسالہ اس بڑی کتاب کا مقدمہ ھے ۔ اس کے الگ ترجمہ کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ اس میں فاضل مصنف نے اپنے فاضلانہ افکار کو بڑی شرح و بسط اور پُر زور اسلوب کے ساتھ بیان کیا ھے ۔ اس میں بڑی خوبی یہ ھے کہ خود قرآن پاک کی آیات اور ان کے مطالب ھی نئی ترتیب و تدوین میں ھمارے سامنے آئے ھیں ۔ اس کا ثبوت آپ کو ان آیات سے ملے گا جنھیں میں نے سہولت اور وضاحت کی خاطر ذیلی حواشی کے تحت میں درج کر دیا ھے ۔

حق ناشناسی ہوگی اگر میں یہ نہ کہوں کہ اس مقدمے کے ترجمے کا کام میرے ھاتوں کیوں کر سر انجام پایا ۔ تقسیم ملک سے دو ایک سال پہلے کی بات ھے کہ میرے بزرگ مرزا عبدالرب قبلہ ، ریٹائرڈ سشن جج نے یہ کتاب مجھے پڑھنے کے لیے دی اور جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ کتاب اور بالخصوص اس کا مقدمہ مجھے بےحد پسند ھے تو انھوں نے فرمایا کہ میں اور میرے دوست میاں عبدالحی (سابق وزیر تعلیم) کی خواہش ھے کہ اس کا اردو میں ترجمہ کر دیا جائے۔ میں نے کچھ امتثال امر اور کچھ عقیدت کے طور اس کام کو فی الفور پورا کیا اور میاں موصوف و مرحوم نے اس پر "تعارف" لکھ کر یہ رسالہ "تاج کمپنی" کے پاس طباعت کے لیے بھیج دیا ۔ میاں مرحوم کا خیال تھا کہ اس کی بہت سی مطبوعہ کاپیاں خرید کر لوگوں میں مفت تقسیم کی جائیں ۔ لیکن بعض حالات کے ماتحت جن کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ، یہ رسالہ چھپ نہ سکا بلکہ اس کا قلمی مسودہ بھی مجھے واپس نہ ملا ۔ حسن اتفاق سے اس کی پہلی نقل میرے پاس موجود تھی ۔ یہ مطبوعہ صورت اسی کا چربہ ھے ۔ البتہ اس میں حواشی قدرے مختلف ھیں اور حواشی میں عربی آیات کا اردو ترجمہ مولوی فتح محمد مرحوم جالندھری کا ھے ۔ اس ترجمے کو ترجیح اس لیے دی گئی ھے کہ یہ ترجمہ ، حضرت شاہ رفیع الدین علیہ الرحمہ اور شمس العلماء

مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجموں کا ایک حسین امتزاج اور اعتدال ہے۔ اس کا مفہوم واضح اور زبان سلیس ، سادہ اور رواں ہے۔

میں اس ترجمے کے کٹھن کام میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں ، یہ پڑھنے والے ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔ البتہ میں نے اپنی طرف سے انتہائی کوشش کی ہے کہ حتی الامکان مطالب اسی حسن اسلوب کے ساتھ بیان کیے جائیں جو ہمیں اصل مقدمے میں نظر آتے ہیں۔ آپ کو ان چند اوراق میں میری استعداد اور کام کی اہلیت سے کہیں زیادہ اس عقیدت و محبت کا عکس نظر آئے گا جو مجھے ''کتاب پاک'' سے ہے اور جو ہر کلمہ گو کے دل میں ہوا کرتی ہے۔

اس رسالے کے ترجمہ کرنے اور چھپانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ ایک جدید روشن خیال قوم کا فرد جسے بالعموم یورپ زدہ کہا جاتا ہے قرآن مجید کے متعلق کیسے سوچتا ہے؟ ترقی پسند ہونے کے باوجود اس کے دینی اور اخلاقی نظریات کیا ہیں؟ اس کے کردار میں فکر و عمل کا کیسا حسین تطابق ہے وہ ادیب بھی ہے اور سپاہی بھی وہ مولوی بھی ہے اور غازی بھی۔ اس نے اپنے اسلامی خیالات کو اپنے ملک کے نوجوانوں اور اجنبی اقوام کے سامنے رکھے ہیں۔ امید ہے ہمارے نوجوانوں کو بھی اس سے بصیرت اور رہنمائی مل سکے گی۔

ایسی کتاب میں جس کے مطالب لطیف اور نازک ہوں کچھ نہ کچھ اختلاف کا پہلو ضرور نکل آتا ہے۔ مجھے مصنف کے بعض نظریات سے اختلاف ہے اور ممکن ہے قارئین کو بھی ہو۔ میں نے حواشی میں ایسے مسائل کی تصریح سے ارادۃً گریز کیا ہے تاکہ پڑھتے وقت عبارت کے تسلسل میں فرق نہ آنے پائے۔ فاضل مصنف کی اتنی اہم اور مخلص کوشش میں ایسے دو چار مقامات کو بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جمع قرآن کا مسئلہ ، خلافت اور آنحضرت ؐ کی معصومیت وغیرہ وغیرہ۔

میں اپنے دوست سید نذیر نیازی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس رسالے کے مسودات کو بہ امعان نظر دیکھا اور بعض مفید مشورے دیے۔ مجھے ارکان ''دارالترجمہ'' بالخصوص اپنے مشفق کرمفرما جسٹس ایس۔ اے رحمان کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جن کی حوصلہ افزائی کے طفیل یہ اوراق چھپ کر ناظرین کے سامنے آئے۔

میں اپنی ان گزارشات کو ان چند عقیدت مندانہ اور محبت و آمیز الفاظ پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو مصنف کے ایک قریبی دوست نے کتاب کے شروع میں لکھے ہیں ۔ کتاب اسی دوست کے نام معنون ہے انتساب کے الفاظ یہ ہیں :-

میں اپنی کتاب ''حکمت قرآن'' کو کتاب ''La Passion d'al-Hallaj'' کے مشہور مصنف پروفیسور لوئی مسینون کے نام سے معنون کرتا ہوں جنھوں نے عمیق تبحر علمی کے ساتھ اسلامی ممالک میں تصوف کی تاریخ کو بیان کیا ہے ۔

محمود مختار

شکریہ انتساب

علیا حضرت شاہزادی ، اہلیہ محترمۂ جرنیل محمود مختار پاشا مرحوم کی خواہش کے مطابق مذکورہ بالا انتساب کے چند الفاظ سے مجھ پر بیک وقت دو فرض عائد ہوتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ اس بات کا شکریہ ادا کروں کہ مجھے اس انتساب کا اہل سمجھا گیا اور دوسرے اس عالمانہ تصنیف کے پڑھنے والوں کو فاضل مصنف کی المناک موت کی اطلاع بھی دوں ۔ یہ کتاب مرحوم کی زندگی کے تجربات اور مطالعہ کا نچوڑ ہے ۔

۱۸ مارچ ۱۹۳۵ء کو دفعتاً ان کی حرکت قلب بند ہوگئی اور قدرت نے انھیں ہم سے چھین لیا ۔ یہ المناک حادثہ تقریباً میری آنکھوں کے سامنے ہوا ۔ ہم اس وقت ایک ساتھ جہاز پر سفر کر رہے تھے ۔ ہمارا جہاز مصر سے روانہ ہو کر سیرا کیوس اور نیپلز کے درمیان تھا ۔ زندگی کے آخری ہفتے میں مرحوم نے اپنی اس عزیز تصنیف کے مطبوعہ اوراق کی تصحیح کا کام سر انجام دیا تھا ۔ ان اوراق کو ان کی آخری وصیت اور یادگار سمجھنا چاہیے ۔ ٹرکی کے مدبرسیاست کا یہ وہ پیغام ہے جو اس نے اپنے بستر مرگ سے نہ صرف اپنے قریبی دوستوں بلکہ اپنے ملک کے تمام نوجوان کے نام بھیجا ہے ۔

پیرس ۔ ۱۹ اپریل ۱۹۳۵ء — لوئی مسینون

مرحوم کا یہ پیغام اب خاکسار کے قلم سے پاکستان کے نوجوانوں تک پہنچتا ہے ۔

لاہور ۳۱ مئی ۱۹۵۵ء ۔ — صوفی تبسم

حکمت قرآن

باسمہ تعالیٰ

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ (ہر وقت کے لئے ایک کتاب ہے، اللہ جو چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے نقش کر دیتا ہے[ا]) یہ الفاظ ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی نازل کردہ کتابوں اور مختلف مذاہب کا حوالہ دیتے ہوئے، قرآن اور اسلام کے آخری پیغام ہونے کا ذکر کرتا ہے۔

قرآن اپنے وقت پر نازل ہؤا۔ اس نزول کے دو اہم مقصد تھے، اول یہ کہ اُن احکام کو منسوخ کردیا جائے جو غیر ضروری تھے اور دوسرے اُن امور کی تائید کی جائے جن کا بحال رہنا لازمی تھا، تاکہ دین کے اساسی اور بنیادی حقائق استوار ہو جائیں۔ یہی وہ دین ہے جس کی تعلیم تمام انبیائے کرام نے دی اور جس کی تلقین موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام نے کی۔ ایک اور آیت میں اس بات کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے:

> ”اللہ نے تمہارے لیے وہی دین کا رستہ ٹھیرایا جس (پر چلنے) کا نوحؑ کو حکم دیا گیا تھا اور یہ وہی رستہ ہے جس کی ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے۔ اسی رستے پر چلنے کی تلقین ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو کی تھی کہ اس دین پر قائم رہنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا“ ب

(ا) الرعد ۳۸، ۳۹

(ب) شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ: ۱۳) (۳۲)

(اس نے تمہارے لیے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس (کے اختیار کرنے) کا نوح کو حکم دیا تھا اور اسی کی (اے محمد) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی تھی اور اس کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا (وہ یہ) کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا)۔

شرعی اور اخلاقی نقطۂ خیال سے قرآن کی تعلیمات مختصراً حسب ذیل هیں :

ایک اور صرف ایک هی خالق کی عبادت کرنا (۱) اور اس کے پیش کردہ اعلیٰ اور ارفع مقاصد حیات کو اپنا مطمح نظر بنا لینا جن کی بنیاد صداقت اور حقیقت پر رکھی گئی ہے۔ (۲) خیرات و زکوٰۃ (صدقات) دین کی اساس هیں۔ (۳) اس

---

(۱) اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ

(۲۰)
(طٰہٰ : ۱۴)

(بے شک میں هی خدا هوں ، میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری عبادت کیا کرو اور میری یاد کے لئے نماز پڑھا کرو)۔

(۲) اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ مَّا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ

(۳۰)
(الروم : ۸)

(کیا انہوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، اُن کو تدبیر (اور حکمت) سے اور ایک وقت مقرر تک کے لیے پیدا کیا ہے)

(۳) لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْہَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ

(۲)
(البقرة : ۱۷۷)

(نیکی کچھ یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور روز قیامت پر اور فرشتوں پر (خدا کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے چھڑانے ، یعنی غلامی وغیرہ کی قید سے آزاد کرانے) میں خرچ کریں)۔

زاویۂ نظر سے دین ایک مستحکم، غیر متبدل اور اٹل
شے ہے۔

دنیا میں جو مختلف گروہ بندیاں نظر آتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کے پرستاروں میں باہمی رقابت ہے اور وہ اپنے غیر ضروری اختلافات میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔ (۴)

پس صحیح مذہب جسکی اللہ تعالیٰ قدیم الایام سے تلقین کرتا چلا آیا ہے، وہی ہے جو فطرت انسانی کی جمیع ضروریات و مقتضیات کو پورا کرے اور بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے ایک صحیح نصب العین کا کام دے۔ (۵)

اللہ تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے۔ اسے ہماری تحمید و ثنا اور عبادت کی ضرورت نہیں، لیکن انسان کے لیے عبادت ایک لازمی امر ہے، کیونکہ یہی ایک

---

(۴) وَمَا تَفَرَّقُوٓا اِلَّا مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ط
(۳۲)
(الشوریٰ : ۱۴)

(اور یہ (اہل کتاب) جو متفرق ہو گئے ہیں، تو علم (حق) آچکنے کے بعد آپس کی ضد سے (ہو گئے ہیں)۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ
(۴)
(النساء : ۱۷۱)

(اے اہل کتاب اپنے دین (کی بات) میں مبالغہ نہ کرو اور خدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو)۔

(۵) فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ

عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ
(۳۰)
(الروم : ۳۰)

(تو تم ایک طرف کے ہو کر دین (خدا کے رستے) پر سیدھا منہ کیے چلے جاؤ اور خدا کی فطرت کو جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (اختیار کیے رہو) خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا دین ہے)۔

وسیلہ ہے جس کے ذریعے وہ اللہ کا قرب حاصل کرسکتا ہے اور اسی کے سہارے عرفان الہی کے بلند مقام پر پہنچ کر اپنے دامن کو گناہوں کی آلودگی سے پاک رکھ سکتا ہے - (۶)

انسان کی کوئی حرکت، کوئی فعل بھی ضائع نہیں ہوتا۔ کیا انسان کیا حیوان ایک دن سب کو اُس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ اُس روز ہر ایک

---

(۶) وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَلَمِينَ

(۲۹)
(العنکبوت : ۶)

(اور جو شخص محنت کرتا ہے اپنے ہی فائدے کے لیے کرتا ہے اور خدا تو سارے جہان سے بے پروا ہے) -

من نہ گردم پاک از تسبیح شان
بلکہ شان گردند پاک و زر فشان

(رومی)

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ (۱۵) (الحجر : ۹۹)

(اور پروردگار کی عبادت کیے جاؤ یہاں تک کہ (تمہاری مدت حیات پوری ہو کر) موت آجائے) -

اُتْلُ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ ط

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ط وَلَذِكْرُ اللّٰهِ

أَكْبَرُ ط (۲۹) (العنکبوت : ۴۵)

(اے محمد) یہ کتاب جو تمہاری طرف وحی کی گئی ہے اس کو پڑھا کرو اور نماز کے پابند رہو بے شک نماز بےحیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے اور خدا کا ذکر بڑا (اچھا کام) ہے) -

کے اعمال اچھے ہوں یا برے ، اُس کے روبرو ہوں گے ۔ (۷)

اسی پر انسان کی آئندہ قسمت کا فیصلہ ہوگا اور اسے اپنے اعمال کی مقرر کردہ جزا وسزا کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا ۔ وہ خالق مطلق اپنی نئی قدرت تخلیق سے ہر انسان کو زندگیٔ تازہ عطا کرے گا اور یہ زندگی

---

(۷) وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ط وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا (۱۷) (بنی اسرائیل : ۱۳)

(اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (کتاب بنا کر) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے اور قیامت کے روز (اس) کتاب کو نکال دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہؤا دیکھے گا) ۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ط (۳۶) (یسین : ۱۲)

(بے شک ہم مردوں کو زندہ کریں گے اور جو کچھ وہ آگے بھیج چکے اور (جو) نشان اُن کے (پیچھے رہے) ہم اُن کو قلمبند کرتے جاتے ہیں) ۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ج (۲۹) (العنکبوت : ۴۰)

(تو ہم نے سب کو اُن کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا) ۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ط مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ط ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ (۶) (الانعام : ۳۸)

(اور زمین میں جو چلنے پھرنے والا (حیوان) یا دو پروں سے اُڑنے والا جانور ہے، اُن کی بھی تم لوگوں کی طرح جماعتیں ہیں ۔ ہم نے کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں کسی چیز (کے لکھنے) میں کوئی کوتاہی نہیں کی ، پھر سب اپنے پروردگار کی طرف جمع کیے جائیں گے) ۔

ایک ایسی صورت میں جلوہ گر ہوگی جسے انسانی تصور آج سمجھنے سے قاصر ہے۔ (٨)

اسلام کے اخلاقی نظام کی بنیاد چار چیزوں پر ہے: خیرات، بے غرضی، خودانکاری یا ترک نفس اورخدمت خلق۔(٩) ایک آیت میں تقویٰ کی وضاحت یوں

---

(٨) وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ○ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ○ اَوْخَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِىْ صُدُوْرِكُمْ ج (١٧)
(بنی اسرائیل : ٤٩–٥١)

(اور کہتے ہیں کہ جب ہم (مر کر بوسیدہ) ہڈیاں اور چور چور ہو جائیں گے تو کیا نئے سرے پیدا ہو کر اٹھیں گے ؟ کہ دو کہ (خواہ تم) پتھر یا لوہا ہو جاؤ یا کوئی اور مخلوق جو تمہارے نزدیک (سنگ و آہن سے بھی) بڑی ہو۔)

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ○ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِىْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (٥٦)
(الواقعة : ٦٠-٦١)

(ہم نے تم میں مرنا ٹھہرا دیا ہے اور ہم اس (بات) سے عاجز نہیں کہ تمہاری طرح کے (اور لوگ) بدل جائیں گے، اور تم کو اس (طرح کی صورت رھیئت) میں جس کو تم جانتے نہیں پیدا کردیں)۔

(٩) وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ○ (٢٨)
(القصص : ٧٧)

(اور جو (مال) تم کو خدا نے عطا فرمایا ہے، اس سے آخرت (کی بھلائی) طلب کیجیے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلائیے۔ اور جیسی خدا نے تم سے بھلائی کی ہے (ویسی) تم بھی (لوگوں سے) بھلائی کرو اور ملک میں طالب فساد نہ ہو کہ خدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا)۔

کی گئی ہے کہ تقویٰ کوئی ظاہری رسمی شے نہیں، بلکہ خیرات، ہمسایوں سے حسن سلوک، اللہ کی محبت، خلوص عبودیت اور نیک اعمالی کا نام تقویٰ ہے۔(۱۰) اور یہ بلند رتبہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ہم کسی ایسی چیز کی قربانی نہ کریں جو ہمیں بےحد عزیز ہو۔(۱۱) جو خیرات محض نمائش کے لئے کی جائے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود نہ ہو وہ بے سود ہے۔(۱۲) ایک جگہ حکم ہوتا ہے کہ تمام باعزت اور قابل ستائش امور میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو، دوسری جگہ اس بات کی تلقین کی جاتی ہے کہ اگر کوئی تم سے ایک نیکی کرتا ہے تو تم اس کے عوض میں دس نیکیاں کرو، (۱۲ا) پھر ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ تمہارا اولین فرض یہ ہے کہ اپنے ہمسایوں سے محبت سے پیش آؤ۔(۱۳)

وَ لَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ (المدثر : ۶) (۷۴)

(اور (اس نیت سے) احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ کے طالب ہو)۔

(۱۰) دیکھو نوٹ نمبر ۲

(۱۱) لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ (آل عمران : ۹۲) (۳)

(تم لوگ جب تک (راہ خدا میں) وہ چیزیں نہ صرف کروگے جن کو تم عزیز رکھتے ہو ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکو گے)۔

(۱۲) وَ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ (النساء : ۳۸) (۴)

(اور خرچ بھی کریں تو (خدا کے لئے نہیں بلکہ) لوگوں کے دکھانے کو، اور ایمان نہ خدا پر لائیں)۔

(۱۲ا) مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا (الانعام : ۱۶۰) (۶)

(جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا تو اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی)۔

(۱۳) اَلۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى (الشوریٰ : ۲۳) (۴۲)

(ان کو) قرابت کی محبت (تو چاہیے)۔

قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ بدی پر غلبہ پانے کا بہترین طریقہ نیکی ہے، دوسروں کی خطاؤں سے درگذر کرنا زندگی کا حقیقی سرمایہ ہے، (۱۴) لیکن عفو صرف توبہ سے حاصل ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ خلوص نیت پر مبنی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور عفو سے صرف وہی فیضیاب ہو سکتا ہے جس کا دل و دماغ اُسے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور پھر ہمیں یہ بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ جہاں جور و ستم اور جبر و تشدد کا مقابلہ ہو، وہاں استقامت سے کام لو اور مضبوطی سے ڈٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔ (۱۵)

غرض اسلام کی تعلیمات کا لب لباب صاف اور واضح طور پر یہی ہے کہ انسان کی ذات صفائے قلب کا آئینہ ہو اور وہ دوسروں سے حسن سلوک روا رکھتا ہو۔ اس میں جوش مردانگی بھی ہے اور طبعی انکسار بھی، شان تمکنت بھی ہے اور بلند حوصلگی بھی، جس میں افراد و ملت دونوں کا مفاد مضمر ہے۔ جہاں اسلام امن و آشتی کے یہ قانون وضع کرتا ہے، وہاں ہمیں یہ بھی حکم دیتا ہے کہ جب کسی جماعت یا قوم کی مخالفت حد سے بڑھ جائے اور اُس کی امن دشمنی لاعلاج ہو تو تم اُس کے خلاف اعلان جنگ کرو اور پھر اُس کے لئے سزائیں بھی تجویز کرتا ہے اور اس حد تک اجازت دیتا ہے کہ اگر کوئی گردن زدنی ہو تو اُس کے قتل سے بھی گریز نہ کیا جائے، (۱۶) لیکن اسلام یہ بھی سکھاتا ہے کہ ان تمام امور میں اعتدال

---

(۱۴) وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۲)

(الشوریٰ : ۴۳)

(اور جو صبر کرے اور قصور معاف کر دے تو یہ حوصلے کے کام ہیں)۔

(۱۵) وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ (۴۲)

(الشوریٰ : ۳۹)

(اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم و تعدی ہو تو (مناسب طریقے سے) بدلہ لیتے ہیں)۔

(۱۶) وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط (۲)
اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (البقرة : ۱۹۰)

کو ملحوظ رکھا جائے، تاکہ انسان کا کوئی اقدام رحم و انصاف کے منافی نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ناانصاف اور ظالم لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۱۷)

قرآن کی رو سے انسانی زندگی ایک نہایت قیمتی اور مقدس شے ہے۔ کسی ایک بے گناہ کا خون بہانا ایسا ہی ہے جیسے ایک انسانی نسل کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ اسی طرح کسی ایک متنفس کی جان بچانا اتنا قابل تحسین عمل ہے، جتنا بنی نوع انسان کو ہلاکت سے بچا لینا۔ (۱۸)

مسلمانوں سے اخوت کا برتاؤ، (۱۹) غیروں سے مساوات اور انصاف پسندانہ

اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی خدا کی راہ میں اُن سے لڑو مگر زیادتی نہ کرو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا)۔

(۱۷) (البقرۃ : ۱۹۰)

(۱۸) كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۵) (المائدۃ : ۳۲)

(ہم نے بنی اسرائیل کو (حکم) لکھ دیا کہ جو شخص کسی کو جان کے عوض کے بغیر یا ملک میں فساد (کی سزا) کے (بندوں کو) مار ڈالے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جو اس کی زندگانی کا موجب ہؤا تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا موجب ہؤا)۔

(۱۹) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ؕ (۴۹) (الحجرات : ۱۰)

(مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو)۔

سلوک(۲۰)،والدین اور اقربا کی محبت و احترام،(۲۱) حق گوئی اور راست گفتاری، ایفائے عہد اور اتمام کار، (۲۲) دوسروں سے لطف آمیز اور ہمدردانہ شفقت کا رویہ، جنسی تعلقات کی پاکیزگی اور عفت، (۲۳) ہمسروں میں تواضع اور خوش خلقی کا اظہار اور اللہ کے حضور میں نیاز مندانہ انکسار، (۲۴) یہ سب کے

---

(۲۰) وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ (۵) (المآئدة : ۸)

(اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو ۔ انصاف کیا کرو کہ یہی تقویٰ کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو) ۔

(۲۱) وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (۲) (البقرة : ۸۳)

(اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا) ۔

(۲۲) وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷) (بنی اسرائیل : ۳۴)

(اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی) ۔

(۲۳) قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۚ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (۲۴) (النور : ۳۰)

(مومن مردوں سے کہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں ۔ یہ ان کے لیے بڑی پاکیزگی کی بات ہے) ۔

(۲۴) وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۳۱) (لقمان : ۱۸)

(اور (غرور سے) لوگوں کی طرف سے منہ مت پھیرنا اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنا کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا) ۔

سب وہ فضائل ہیں جن کی تلقین کے بارے میں قرآن مجید کا ہر صفحہ لبریز ہے۔ قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ حسن گفتار اور حسن کردار ہی سے انسان کو روحانی ارتقا نصیب ہوتا ہے اور وہ اسی کے ذریعہ قرب الٰہی حاصل کر سکتا ہے (۲۵) وہ ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ جب زمانے کے مصائب و حوادث تمہیں گھیرے ہوئے ہوں تو ہمت نہ ہارو، جب زندگی کی تلخیوں اور غم و آلام کے بادل چھا جائیں تو صبر و استقامت کو ہاتھ سے نہ چھوڑو اور ہر نیک عمل کو سرانجام دینے کے لیے انتہائی استقلال سے کام لو (۲۶) غرض کوئی فضیلت، کوئی وصف، وہ شخصی ہو یا اجتماعی، ایسا نہیں جس کی اسلام نے تلقین نہ کی ہو اور جسے قرآن تقویٰ اور دین کے اعلیٰ اور ارفع مقاصد اور نصب العین میں شمار نہ کرتا ہو۔

انہی ارفع فضائل اخلاق کے مدنظر جو تقویٰ کا جزو لاینفک ہیں، ایک مومن کی زندگی دو متضاد کیفیتوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ ایک طرف وہ اس بات سے خوف زدہ رہتا ہے کہ کہیں غفلت و کمزوری کے عالم میں اس سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو جائے اور دوسری طرف خدا کی عبادت اور پرستش اور اس کے بندوں سے نیکی کر کے رحمت ایزدی کا امیدوار بھی ہوتا ہے۔(۲۷)

---

(۲۵) مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۚ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ (۳۵) (الفاطر: ۱۰)

(جو شخص عزت کا خواستگار ہے تو عزت سب خدا ہی کی ہے۔ اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل ان کو بلند کرتے ہیں)۔

(۲۶) دیکھو حاشیہ نمبر ۳

(۲۷) ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (۷) (الاعراف: ۵۵)

(اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چھپا چھپا کر دعائیں مانگا کرو وہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا)۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام کثرت ازواج کا حامی ہے، لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مشرق میں یہ رسم قدیم الایام سے چلی آتی تھی اور اس کا دائرہ بے حد وسیع تھا۔ زیادہ قابل غور یہ امر ہے کہ خود انجیل میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اسلام ہی نے اس کی تنسیخ کی راہ نکالی اور ازواج کی تعداد کو چار تک محدود کر دیا اور ساتھ ہی اس بات کی بھی تلقین کر دی کہ ایک ہی بیوی کا ہونا نہایت مستحسن ہے۔(۲۸) مرد عورتوں سے جو ظالمانہ سلوک روا رکھتے تھے، قرآن نے اس کے متعلق بھی قواعد و ضوابط وضع کر دیے اور اس طرح عورتوں کے حقوق کو محفوظ کر دیا۔ اسی طرح قرآن میں ان احکام کی بھی کثرت ہے جن کی رو سے عورتوں پر مردوں کے غیر معمولی تفوق اور ان کے وسیع اختیارات و حقوق کو محدود کر دیا گیا ہے۔

غلامی کی رسم، تہذیب انسانی کے چہرے پر ایک بد نما دھبا تھی۔ یہ رسم انیسویں صدی تک جاری رہی۔ قرآن کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ جن میں غلاموں کو آزاد کرنے پر اس قدر زور دیا گیا کہ وہ امتناع غلامی کے مترادف ہے۔(۲۹) اس تاکید کے باوجود اگر یہ چیز مسلمانوں میں کچھ مدت تک قائم رہی، جیسا کہ اور اقوام کے یہاں تھی تو اس کی وجہ محض انسانی حرص و آز کا جذبہ تھا اور بس۔

ملت اسلامی کے ہر فرد کے لیے پانچ شرائط یا ارکان اسلام کا پورا کرنا ضروری ہے:

---

(۲۸) فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (۳) (النسآء : ۳)

(اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو صرف ایک عورت (سے نکاح کرو)۔

(۲۹) وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ (۳۲)
(النور : ۳۲، ۳۳)

(اور اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو نیک ہوں نکاح کر دیا کرو)۔

(۱) نماز پنجگانہ، تاکہ اللہ تعالیٰ کی لگاتار عبادت کی جائے۔ (۳۰) (اس میں مومن کی جسمانی اور روحانی پاکیزگی لازمی ہے اور اس طہارت و پاکیزگی کے لیے طریقے مقرر کر دیے گئے ہیں)۔

(۲) سال بھر میں ایک مہینے کے لیے روزہ رکھنا (ماہ رمضان)۔

(۳) حج کعبہ: وہ لوگ جو استطاعت رکھتے ہوں، انھیں زندگی بھر میں کم از کم ایک بار کعبے اور مکے کی زیارت کے لیے جانا۔

(۴) زکوۃ: جائداد منقولہ کا چالیسواں حصہ ادا کرنا، تاکہ اس سے حاجت مندوں اور ناداروں کی ضروریات پوری ہوں۔

(۵) اللہ تعالیٰ کی توحید اور پیغمبر کی رسالت کا اقرار۔

اسلام کا سب سے نمایاں اور مستحکم اصول جس پر اس کی پوری عمارت کی بنیاد رکھی ہے، اصول رواداری ہے جسے مسلمانوں نے دنیا کے دو بڑے مذاہب کے ساتھ روا رکھا۔ قرآن میں آتا ہے (۳۱) کہ "مذہب کے معاملات میں کوئی سختی نہیں ہونی چاہیے۔" ان الفاظ میں ایک ایسے اصول کا راز مضمر ہے جس پر ہمیشہ شدت سے عمل کیا گیا۔ اسلامی ممالک میں یہود و نصاریٰ کو ہمیشہ پوری مذہبی آزادی حاصل رہی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں، اپنے اپنے طریق پر عبادت کریں اور اپنے ملی اور قومی حقوق کی نگہداشت کریں۔

شرع اسلامی کے مطابق تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی وہ زندگی ہے جو جسمانی موت کے بعد بھی قائم رہتی ہے، اس لیے قرآن کہتا ہے کہ

---

(۳۰) فَسُبْحَانَ اللّٰہِ حِینَ تُمْسُونَ وَحِینَ تُصْبِحُونَ (۳۰) (الروم : ۱۷)

(تو جس وقت تم کو شام ہو اور جس وقت صبح ہو خدا کی تسبیح کرو)

(۳۱) لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّینِ (۲) (البقرہ : ۲۵۶)

(دین (اسلام) میں جبر اور زبردستی نہیں ہے)۔

یہ عارضی اور فانی زندگی تمھیں اس لیے عطا کی گئی ہے کہ تم اپنے میں روحانی صلاحیت پیدا کر لو۔ یہاں جیسا بوؤگے ویسا کاٹوگے۔ اچھا ہو یا برا، (۳۲) اللہ تعالیٰ ہر اُس انسان کی مدد کرتا ہے جو اُس کی راہ پر چلتا ہے۔ غرض ''اللہ کی مدد کرو اور وہ تمہاری مدد کرے گا'' کا اصول اسلام کی سپرٹ کے عین مطابق ہے۔(۳۳)

دنیا میں انسانوں کے اندر جو فرق مراتب اور مال و دولت کی غیر مساویانہ تقسیم نظر آتی ہے، قرآن کی رو سے یہ بھی ایک طریقہ ہے جس سے قدرت ہماری آزمائش کرتی ہے۔ اللہ کے نزدیک صرف وہی انسان قابل احترام ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔(۳۴) اسلام میں ایسے ہی لوگ قوم کے امیر یا سردار ہو سکتے ہیں جو سچے اور باعمل متقی ہوں۔ یہ انداز تصور اس جمہوری سپرٹ کی روح رواں ہے جس کا مظاہرہ روزمرہ کی مذہبی رسوم اور عبادات میں بھی کیا جاتا ہے۔ بندے اور اُس کے معبود اور خالق کے درمیان کوئی پادری، کوئی کلیسائی منصب داری حائل نہیں ہو سکتی، اسلام میں عیسائیت کی طرز کا کوئی کلیسائی تصور موجود نہیں، اس میں نہ بنی اسرائیل کے سے پادری ہیں نہ پیران کلیسا۔

---

(۳۲) وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی (النجم (۵۳) : ۳۹ - ۴۱)

(اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا)۔

(۳۳) وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ط (الحج (۲۲) : ۴۰)

(اور خدا اس شخص کی ضرور مدد کرتا ہے جو خدا کی مدد کرتا ہے)۔

(۳۴) اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات (۴۹) : ۱۳)

(اور خدا کے نزدیک تم میں عزت والا تو وہ ہے جو پرہیزگار ہے)۔

کسی ایک تاریخی واقعہ کا جو عہد ماضی میں کسی معین وقت پر ظہور پذیر ہؤا ہو ، اجتماعی طور پر کسی قوم کے گناہوں کی تلافی کرنا یا کسی دیوتا کا دنیا میں جور و ستم برداشت کرکے بنی نوع انسان کی نجات کا باعث ہونا ایک ایسا خیال ہے جس سے ایک مومن کا دل و دماغ کلیۃً بیگانہ ہے۔(۳۵) مومن کی نظر ہمیشہ اس دنیا کے درخشاں پہلو پر پڑتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ نیکوکار آخر کامگار ہوتے ہیں ۔ اس کا یہ ایمان ہے کہ آسمان و زمین آیات الہیہ سے معمور ہیں اور ان سے جو نعمتیں انسان کو حاصل ہوتی ہیں وہ سب کی سب رحمت ایزدی کی دلیل ہیں۔(۳۶) قرآن کا بیان ہے کہ یہ کائنات بذات خود صداقت و حقیقت کا مظہر ہے۔ یہ دنیا اللہ ہی کے وجود سے قائم ہے اور اسی کی نعمتوں سے فیضیاب ہوتی ہے۔(۳۷) اللہ اور صرف اللہ ہی وجود اشیاء کا سر چشمہ ہے۔ دنیا میں کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آسکتا ، جب تک اس کا معرض ظہور میں آنا اللہ تعالیٰ کے منشا کی تکمیل کے لیے لازمی نہ ہو ۔ شر بھی جس کے آتشیں اثرات تباہ کن ہیں ، اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر معرض وجود میں نہیں آسکتا۔ اگرچہ انسان اپنے اعمال میں بڑی حد تک مختار ہے اور اس اختیار کا ہونا اس کے ارتقاے حیات کے لیے لازمی امر ہے ، تاہم یہ خیر و شر اور یہ انسانی زندگی کی ترقی دوسرے واقعات کائنات کی طرح اللہ ہی کے ارادے کے ماتحت ظہور میں آتے ہیں۔(۳۸)

---

(۳۵) وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (الاعراف (۷) : ۱۲۸)

(اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے)۔

(۳۶) وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ (الذریات (۵۱) : ۲۰)

(اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں)۔

(۳۷) وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ (الانعام (۶) : ۷۳)

(اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو تدبیر سے پیدا کیا)۔

(۳۸) مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (النساء (۴) : ۷۹)

((اے آدم زاد) تجھ کو جو فائدہ پہنچے ، وہ خدا کی طرف سے ہے)۔

اسلام میں زندگی کا زرین اصول یہ ہے کہ انسان ہر شے سے نیک اور جائز فائدہ حاصل کرے اور کسی چیز کو ناجائز طور پر استعمال نہ کرے، بلکہ اسلام نے ہمیں یہاں تک اجازت دے دی کہ ہر خوشی اور راحت سے پوری طرح تمتع حاصل کرو، لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رہے کہ یہ تمتع سادہ اور معصوم ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا دامن عیش و نشاط کے سفلی میلانات سے آلودہ ہو جائے۔ دنیا کی نعمتوں کو جو تمہارے لیے مہیا کی گئی ہیں مت ٹھکراؤ۔ (۳۹) لیکن اس بات کو بھی ملحوظ رکھو کہ ان نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونا، دیانت، عزت اور خلوص کے دائرے سے تجاوز نہ کر جائے۔

اسلام مومنوں کے لیے زندگی کی دو راہیں پیش کرتا ہے۔ ایک وہی دین قیم کی شاہراہ یا صراط مستقیم ہے جس پر بیشتر ایمان لانے والے چلتے ہیں اور جو وہی شریعت و اخلاقیات کی راہ ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ دوسری راہ، طریقت کی راہ ہے۔ یہ راہ محدود اور دشوارگذار ہے اور صرف ان ہستیوں کے لیے مخصوص ہے جو احساس خودی کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں، جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، کھو دینا چاہتے ہیں اور جو اپنے ہر ارادے کو اسی ذات کے ارادے پر نثار کر دیتے ہیں جس کے منشا کے بغیر کائنات کا ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ عرفان الٰہی کے لیے ہر دم کوشاں رہتے ہیں۔ یہ طریقت کی راہ، راہ سلوک ہے اور اس راہ پہ چلنے والا سالک کہلاتا ہے۔ سالک کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عبادت، مناجات، تفکر اور ریاضت کے ذریعے اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرے۔

مرشد کی ہدایت اور روحانی اثر کے ماتحت، عبادت اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و ثنا اور اس کی بعض صفات کے اعادے سے صوفی پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس سے اس کا غیر شعوری احساس بیدار ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس کا نفس روحانیت میں کھو جاتا ہے۔

---

(۳۹) وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (۲۸) (القصص : ۷۷)

(اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلائیے)۔

تصوف، اُس کے نظریات، طریق ریاضت (۳۰) اور تسلیم و رضا و توکل کا انحصار قرآن کی بعض آیات پر مبنی ہے۔ صوفیا کو اہل توحید بھی کہا جاتا ہے جنھیں جدید فلسفیانہ نظام کے ماتحت روحانی موحد کہنا چاہیے۔

اہل طریقت کے کئی ایک گروہ ہیں جو تمام ممالک اسلامیہ میں موجود ہیں۔ یہ گروہ گویا ایسی جماعتیں ہیں جو اخوت یا برادری کے سلسلے میں منسلک ہیں۔ یہی لوگ ایشیا اور افریقہ کے اندرونی اور تاریک علاقوں میں انسانی تہذیب کے علمبردار تھے اور انھی ہستیوں کی بدولت ان ظلمت کدوں میں رشد و ہدایت کا نور پھیلا۔

لیکن آج ان میں سے بعض گروہ ایسے بھی ہیں جو اس قدر پست ہو گئے ہیں کہ خود اُن کی اپنی ہستی معرض خطر میں ہے۔

وہ اسباب جنھوں نے اسلام کو بھی ممالک ہندوستانی جزیرہ نما کے دوسرے مذاہب کی طرح ایک باطنی دینی نظام بنا دیا تھا، ابتدائی صدیوں ھی میں پیدا ہو گئے تھے۔

جب حضرت عمر رضؓ بن الخطاب جو آنحضرت ﷺ کے مشیر خاص اور آن کے خلیفۂ ثانی تھے، شہید ہوئے تو اسلامی حکومت میں ابتری کے آثار پیدا ہونے لگے۔ ہر شخص میں کچھ بننے اور نمایاں ہونے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جن لوگوں کے پاس بہتر بننے کے اعلیٰ جوہر نہ تھے آنھوں نے ایک خاص منصب اپنے ذمے لے لیا اور اس خصوصیت سے ایک امتیازی شان پیدا کرنی چاہی۔ یہ محدثوں کا گروہ تھا جن کا کام یہ تھا کہ رسول اکرم ﷺ کے اقوال اور افعال کو اس طرح زندہ رکھا جائے کہ آئندہ نسلوں کے لیے ایک یادگار ہو۔

ابتدائی صدیوں میں ایسے اقوال یا احادیث کے وضع کرنے کا سلسلہ جو نبی صلعم سے منسوب کی گئیں، بڑی تیزی سے چلا۔ ان میں بیشتر اقوال ایسے تھے جن میں بدعت و الحاد کی آمیزش تھی۔ ہر نئی اسلام لے آنے والی

---

(۳۰) یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰهَ ذِکْرًا کَثِیْرًا (۳۳)
(الاحزاب : ۴۱)

(مومنو! خدا کا بہت ذکر کیا کرو)۔

جماعت نے اس ذخیرۂ احادیث میں اضافہ کیا ۔ بعض (ا) حدیثیں توریت یا انجیل (ب) سے لی گئیں ۔ بعض میں لاطینی ، یونانی ، ہندوستانی اور ایرانی اثر نمایاں تھا ۔ رواقی فرقے کے عقائد بھی اس میں شامل ہوگئے ۔ غرض حدیث روایتی ادب کا مجموعہ بنتی چلی گئی ۔ یہاں تک کہ ایسی حدیثیں بھی جمع ہوگئیں جو ایک دوسرے کی ضد تھیں ۔ ان میں سب سے زیادہ سادہ ، بے ضرر اور قطعی ، صرف وہی تھیں جنھیں قرآن کی آیات کی صورت بدل کر اور حدیثی رنگ دے کر وضع کر لیا گیا تھا ۔

مختصر یہ کہ آنحضرتؐ کی طرف منسوب کیے ہوئے عقائد کا ایک سیلاب سا آمڈ آیا ۔ ڈر تھا کہ اسلام کے سادہ عقائد اس سیلاب کی تیز رو میں نہ بہ جائیں ، لیکن اس خطرے کو بہت جلد محسوس کر لیا گیا ۔ چنانچہ اس کی روک تھام کے لیے مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس کی زندگی کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان احادیث کی دیکھ بھال اور پڑتال کرے ۔ مستند حدیثوں کی پرکھ کے لیے سلسلۂ رواۃ قائم کیا گیا ، جن کے ذریعے کوئی حدیث آنحضرتؐ سے چلی اور اسی سلسلۂ رواۃ کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے پر کسی حدیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کی بنیاد رکھی گئی ۔ جو حدیث بغیر سلسلہ ٹوٹنے کے آنحضرتؐ یا آن کے کسی صحابی تک پہنچتی تھی آسے صحیح تسلیم کر لیا جاتا ۔ صحابہ کا احترام اس قدر زیادہ تھا کہ آن کی بیان کردہ روایت ، ناقدین حدیث کے لیے سند کا حکم رکھتی تھی ۔

اس تحقیق سے غلط احادیث پورے طور پر خارج تو نہ ہو سکیں لیکن آن بے شمار روایات کی تعداد جو لوگوں میں رائج ہو چکی تھیں بہت کم ہوگئی ۔ اگرچہ اس وقت بھی کئی ایک مجلدات پر مشتمل ہیں ۔ تاہم آس سے شرع اسلامی کی بنیادیں مضبوط ہوگئیں ۔ تیسری صدی ہجری میں علم حدیث نے باقاعدہ منظم صورت اختیار کر لی اور لوگ قرآن کے مقابلے میں زیادہ تر اسی سے استنباط کرنے لگے ۔ چنانچہ احادیث اسلامی زندگی کا معیار بن گئیں ۔

کم و بیش اسی عہد میں وہ چار امام بھی ہوئے ، جنھوں نے فقہ اسلامی کی تشکیل کی اور جن کے وضع کردہ قوانین شریعت پر چار مختلف

(ا) بلکہ اکثر (مترجم)

(ب) بلکہ اباطیل بنی اسرائیل (مترجم)

مذاهب کی بنیاد رکھی گئی ۔ عوام ان مقدس هستیوں کے ارشادات کو بے غلط سمجھنے لگے اور اُن کے غور و فکر کے نتائج کو وهی رتبه دیا گیا جو احادیث کو دیا گیا تھا ۔

ایسی مستند تعلیمات کے مجموعے کو تسلیم کر لینے سے اسلام کی فوقیت اور اعلیٰ مقاصد میں ایک رسمی رنگ پیدا ہوگیا ، جس نے رفته رفته کلیسائی صورت اختیار کر لی (ا)۔

بسا اوقات اس طرح کے حالات انسانی طبائع میں بے اطمینانی اور بے چینی پیدا کر دیتے ہیں اور پاکیزہ روحیں مذهب کی خشک ظاهریت سے تنگ آ کر باطنی مشارب میں پناہ لیتی هیں اور اس میں وہ روحانی عرفان حاصل کرکے مذهب کے رسوم سے نجات حاصل کر لینا چاهتی هیں ۔ غرض خود اسلام کے سینے میں زاهدانه جذبات کی ایک لہر اُٹھی اور اُس سے وسیع تحریکات کا سلسله چلا ۔ قرآن کے عام رنگ اور انداز نے ایسے باطنی مسالک کو اور بھی تقویت دی ۔ یه سب کچھ لازمی امر تھا ، لیکن علمائے شریعت نے صدیوں تک طریقت کے ان اصولوں کو بدعت سے تعبیر کیا اور اسے نه صرف غیر ضروری بلکه خطرناک اختراع سمجھا ۔

حقیقت یه هے که یه برادران طریقت رفته رفته اپنے اصلی مقاصد سے دور ہوتے چلے گئے اور آج اُن کے موجودہ پیروکار اپنی جہالت اور توهم پرستی کی بدولت پست هو چکے هیں اور اُن کی وہ قدر و منزلت نہیں رهی ، جو اُن کے بزرگوں کو جائز طور پر حاصل تھی ۔ ٹرکی میں جدید رجحانات کی اُبھرتی هوئی رو نے اُنھیں سختی سے دبا دیا ، تاکه قدامت پسندی کے جمله وسائل منقطع هو جائیں ۔

قرآنی الٰہیات میں لطیف و نازک دقائق بھی هیں اور بلند و ارفع تصورات بھی ۔ اُس کی رو سے خدا کی هستی انسانی تصور سے بالاتر هے ۔ اُس جیسی اور کوئی شے نہیں ۔ اُسے روح بھی نہیں کہا جا سکتا ، کیونکه روح بذات خود

(ا) کلیسا فرانسیسی لفظ Eglise کا ترجمه هے ، لیکن اس کا مفهوم غالباً لفظ ''مذهبی جماعت'' سے ادا هو سکے گا ۔ مصنف کا یه بیان اُس کے پہلے بیان سے متناقض نہیں ۔ کلیسا اور پادری کے منصب روحانی کے تصور سے اسلامی تعلیمات بالکل منزہ هیں (مترجم انگلیسی) ۔

مخلوق (۴۱) ہے، وہ خلاق علیم (۴۲) ہے، اُس کے کام میں کسی مخلوق کو کوئی دخل یا تصرف حاصل نہیں۔ وہ اپنی ذات کی موجودگی سے ہر شے کو حسین بنا دیتا ہے۔ (۴۳) اُس کی قدرت سے ہر چیز میں ارتقائی عمل جاری ہے۔ اُس کی قدرت ہرشے پر طاری وساری ہے۔ اُسی کی قدرت سے بیج پھلتا پھولتا ہے۔ (۴۴) وہی موت و حیات کا مالک ہے۔ وہی اشیا کی تربیت کرتا اور اُنھیں تہ و بالا کرتا ہے۔ جب کوئی بیمار پڑتا ہے تو شفا دینے والا بھی وہی ہے۔ اُس کی ذات کائنات سے الگ نہیں ہو سکتی۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا، سنتا ہے اور

---

(۴۱) لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (۴۲) (الشوریٰ : ۱۱)

(اُس جیسی کوئی چیز نہیں)۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۱۷) (بنی اسرائیل : ۸۵)

(کہ دو کہ وہ (روح) میرے پروردگار کی ایک شان ہے)۔

(۴۲) وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ وَیَخْتَارُ مَا کَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وتعالیٰ عما یشرکون (۲۸) (قصص : ۶۸)

(اور تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) برگزیدہ کرلیتا ہے، اُن کو (اس کا) اختیار نہیں ہے۔ یہ جو شرک کرتے ہیں خدا اس سے پاک اور بالاتر ہے)۔

(۴۳) اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲) (السجدہ : ۷)

(جس نے ہر چیز کو بہت اچھی طرح بنایا (یعنی اس کو پیدا کیا)۔

(۴۴) اَفَرَءَیْتُمْ مَا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (۵۶) (الواقعة : ۶۳-۶۴)

(بھلا دیکھو تو کہ جو کچھ تم بوتے ہو، تو کیا تم اُسے اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں)۔

ہر شے پر قادر ہے۔ وہ ہر ایک کاگہرا ساتھی اور رہنما ہے۔(۴۵) اگر ہم خدائی نگہداشت اور شفا سے بہرہ یاب ہوں ، تو ہمیں ہر لحظہ اُس کے حاضر و ناظر اور علیم و بصیر ہونے کا احساس ہونا چاہیے اور ہمیشہ اُسی کے حضور میں دست بدعا رہنا چاہیے ۔ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کا حامی و ناصر ہے جو اُس پر ایمان لاتے ہیں اور اُس کی راہ میں چلتے ہیں جو صراط مستقیم اور نجات کی راہ ہے۔(۴۶) جب ہم نیکی سے بدی یا بدی سے نیکی کی طرف مائل ہوتے ہیں تو اُسی کے مطابق اُس کا رویہ بھی بدل جاتا ہے ، وہ ہر انسان

---

(۴۵) اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ○ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ○

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ○ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ○

(۲۶)
(الشعراء : ۷۸ - ۸۱)

(جس نے مجھے پیدا کیا ، پھر وہی مجھے رستہ دکھاتا ہے ، اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے ، اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے اور جو مجھے مارے اور پھر زندہ کرے گا)۔

(۴۶) ان الذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰتِ سیجعَلُ لھم الرحمن ودآ

(۱۹)
(مریم : ۹۶)

(اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کیے خدا اُن کی محبت (مخلوقات کے دل میں) پیدا کردے گا)۔

فاذکرونی اذکرکم وَ اشکروالی ولا تکفرون

(۲)
(بقرہ : ۱۵۲)

(تو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا اور میرا احسان مانتے رہیو اور ناشکری نہ کیجو)۔

اعبدواللہ مالکم من اِلٰہٍ غیرُہٗ

(۱۱)
(ھود : ۵۰)

(خدا ہی کی عبادت کرو ، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں)۔

کو ہمیشہ کی سلامتی کی طرف بلاتا ہے اور جو لوگ اس کی طرف لوٹ آتے ہیں، انھیں اپنی رحمتوں کا امیدوار بناتا ہے۔(۴۷)

اللہ ایک ہے، وہ حیات و قدرت کا سرچشمہ ہے، (۴۸) اول و آخر وہی ہے، اشیاء کی ابتدا و انتہا اسی سے ہے، (۴۹) وہ خالق مطلق ہے، وہ نہ صرف انسان کو پیدا کرتا ہے، بلکہ انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کو تکمیل تک پہنچاتا

---

(۴۷) واللہ یدعوا الی دارالسلام و یھدی من یشاء الی صراطٍ مستقیم (۱۰) (یونس : ۲۵)

اور خدا سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا ہے)۔

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ (۳۹) (زمر : ۵۳)

(خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا)۔

(۴۸) وان من شیءٍ الا عندنا خزائنہٗ وما ننزّلہٗ الّا بقدرٍ معلوم٥ (۱۴) (حجر : ۲۱)

(اور ہمارے ہاں ہر چیز کے (بیشمار) خزانے ہیں اور ہم ان کو بمقدار مناسب اتارتے رہتے ہیں)۔

ان القوۃ للہ جمیعا (۲) (بقرہ : ۱۶۵)

(سب طرح کی طاقت خدا ہی کو ہے)۔

لاقوۃ الّا باللہ (۱۸) (کہف : ۳۹)

(نہیں کوئی طاقت سوائے اللہ کے)

(۴۹) ھوالاولُ والآخر والظاھر والباطن و ھو بکل شیءٍ علیم (۵۷) (حدید : ۳)

(وہ (سب سے) پہلا اور (سب سے) پچھلا اور (اپنی قدرتوں سے سب پر) ظاہر اور (لوگوں کی نگاہ سے) مخفی ہے اور وہ سب چیزوں کو جانتا ہے)۔

ہے۔(۵۰) پس اللہ کی ذات باقی اور ابدی ہے اور کائنات کے ہر ذرے میں اسی کا ظہور ہے۔ اس کا ارادہ قوی اور اٹل ہے۔(۵۱) اسے ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں ، لیکن وہ ہمارے دلوں کی ہر خواہش و التجا سے واقف ہے۔ وہ لطیف ہے ، غیر محسوس ہے۔ ایک ایسی ہستی جو ساری کائنات پر حاوی اور محیط ہے۔(۵۲)

اگرچہ خدا رحیم اور رحمٰن ہے ، لیکن جو لوگ اس کی حکم عدولی کرتے ہیں اور اس کے منشا کے خلاف چلتے ہیں ، وہ ان سے انتقام بھی لیتا ہے۔ اگر چہ وہ حیات کا خالق ہے، لیکن موت بھی اسی کے قبضۂ اقتدار میں ہے۔ جنت اور اس کی ابدی خوشیوں کا سرچشمہ بھی وہی ہے اور دوزخ کے بھڑکتے ہوئے شعلے اور ہمیشہ رہنے والے دردناک عذاب کا پیدا کرنے والا بھی وہی۔ اگرچہ ظاہرا ان بیانات میں تضاد نظر آتا ہے ، تاہم یہ باتیں غور طلب ہیں ، اس لیے کہ تمام دینی امور میں غور و خوض کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔

خدا جس کا عمل ہر جگہ طاری و ساری ہے، جو اپنے ارادے میں وسعت کاملہ رکھتا ہے ، جس کی ہستی ابدی ہے اور جس کا وجود ارتقائے حیات

---

(۵۰) واللہ خلقکم وما تعملون (صافات : ۹۶) (۳۷)

(حالانکہ تم کو اور جو تم بناتے ہو۔ اس کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے)

(۵۱) یسئلہٗ من فی السموات والارض ط کل یوم ھو فی شان (الرحمن : ۲۹) (۵۵)

آسمان اور زمین میں جو کوئی ہے۔ سب اسی سے مانگتے ہیں ، اسے ہر روز (اپنی مخلوق کے) کام ہیں)۔

(۵۲) لاتدرکہ الابصار وھو یدرکُ الابصار وھو اللطیف الخبیر (انعام : ۱۰۳) (۶)

((وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کو نہیں پہنچ سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے اور بھید جاننے والا اور خبر دار ہے)۔

کی روح رواں ہے، قادر مطلق، غیر محدود اور تغیر ناپذیر ہے۔ وہ بزرگ و برتر خدا، زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے اور اُس کی ذات پاک اُن تمام حوادث و آلام سے مصؤن و منزہ ہے جو اس فانی زندگی سے وابستہ ہیں۔

خدا تعالیٰ کی ہستی وہ ارفع اور اعلیٰ ہستی ہے جس کے ارادے اور منشاء کا ظہور و ارتقا کائنات کے لامحدود سلسلۂ حیات میں جاری ہے۔ اس بزرگ و برتر ہستی میں جس تک انسانی عقل کی رسائی ناممکن ہے اور اس عالم محسوس میں جو ابھی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے، ایک وسیع فاصلہ حائل ہے۔ ایسا فاصلہ جسے قرآن کی ایک آیت کی رو سے ملائکہ اور روح بھی پچاس ہزار سال میں طے کر سکیں۔ یہ وسیع فاصلہ فی الحقیقت محض کیفی اور نوعی اختلاف کو ظاہر کرتا ہے جسے مقداری رنگ و استعارہ میں بیان کیا گیا ہے۔(۵۳)

یہ چیز بآسانی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ وہ تغیر ناپذیر اور مجرد ذات اس عالم امکان میں کیوں کر آجاتی ہے؟

ان دو روحانی حالتوں کو بیان کرنے کے لیے قدما نے اس دقیق فلسفیانہ مسئلہ کو استعارے کے انداز میں بیان کیا تھا۔ لیکن ایسا کرنے سے خود باری تعالیٰ کی وحدانیت کے تصور میں شرک کا رنگ، بلکہ بت پرستی کا شائبہ پیدا ہو گیا۔ عیسائیت کے تصور تثلیث کا انحصار جو ایک تازہ زمانے کی پیداوار ہے، اسی سلسلۂ مراتب روحانی کی ایک کڑی ہے جس میں مجرد کو مقرون اور مطلق کو محدود سے ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام کا تصور توحید ایسے تصورات کو بالکل گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس لیے علمائے الٰہیات (دینیات) نے فقط یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات

---

(۵۳) تَعرُجُ الملائکۃُ والروحُ الیہ فی یوم مقدارہٗ خمسین الف سنۃ (معارج : ۴)
(۷۰)

(جس کی طرف روح (الامین) اور فرشتے چڑھتے ہیں اور اس روز (نازل ہوگا) جس کا انداز پچاس ہزار برس ہوگا)۔

بزرگ و برتر ذات ہے ، وہ لا شریک ہے ، لا یتجزیٰ ہے ، کائنات کا منبع اور سرچشمہ ہے ، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے (۱) کہ وہ فی الحقیقت کیا ہے ؟ اور اس کے افعال کی نوعیت کیا ہے ؟ کیونکہ وہ ان تمام چیزوں سے مختلف ہے جنھیں ہم جانتے ہیں اور وہ اُن تمام اشیا کے مشابہ نہیں کہا جا سکتا جو ہمارے تجربے میں آتی ہیں ۔ تاہم لوگوں نے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی اور اس میں اُن صفات (اسمائے) الٰہیہ سے کام لیا جن کا ذکر قرآن میں آتا ہے ۔ یہ صفات تین طرح کی ہیں :

(۱) صفات نفسی : وجود باری، خدا موجود ہے ۔

(۲) صفات ذاتی : وہ ازل سے ہے، ابد تک رہے گا۔ وہ کامل ہے، وہ مبدع اشیا ہے، وہ ایک ہے۔

(۳) صفات ثبوتی : وہ زندہ (حی) ہے، وہ حکیم ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، صاحب ارادہ ہے، متکلم ہے، خالق ہے ۔

یہ تیرہ صفات ذات باری تعالیٰ کو ظاہر کرتی ہیں :

دینیات میں ایسی صفات کی تعداد ننانوے ہے جو سب کی سب قرآن مجید (کے ننانوے اسمائے الٰہیہ) سے ماخوذ ہیں ۔ اگر اس مسئلے پر خارجی اور مادی تصور کے ماتحت غور کیا جائے تو یہ صفات بحیثیت مجموعی ایسے روحانی عناصر ہوں گے جن کے بغیر نہ کوئی کونی ارتقا ممکن ہو سکتا ہے اور نہ ہی مختلف النوع موجودات کی طبعی استعدادوں کی ترقی کا امکان ہو سکتا ہے ۔

وجود باری کے اس تصور کی رو سے، اُس کی ذات ایک روحانی سورج ہے جس کی شعاعیں یہ صفات ہیں ۔ انھی شعاعوں سے اشیائے کائنات خلق ہوتی ہیں ، زندہ رہتی اور بدلتی رہتی ہیں ۔

اس اعتبار سے اسلامی عقائد کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) ذات الٰہی : جو زندگی کا سرچشمہ ہے۔

(۲) صفات الٰہی : جو ذات الٰہی کے لوازم ہیں۔

(۳) افعال الٰہی : جو اس ذات سے صادر ہوتے ہیں۔

---

(۱) دور بینان بارگاہ الست بیش ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

یہ تینوں چیزیں اُس سلسلے کی تین کڑیاں ہیں جو مجرد سے مقرون اور ارادۂ ایزدی سے لے کر اس مادی کائنات کے ظہور تک کے فاصلے کو ظاہر کرتی ہیں اور اُن کا انحصار محض انسانی تصورات پر ہے اور جو تمام کی تمام قرآنی آیات پر مبنی ہیں۔(۵۳) یہ امر واضح ہے کہ علمائے دینیات کبھی اس بات کو گوارا نہ کر سکتے تھے کہ مبحث ذات و صفات الٰہی کو کوئی ایسی مادی یا خارجی صورت دیں جس سے عقیدۂ تثلیث کا شائبہ پیدا ہوتا ہو۔

اس طرح کی پیچیدگیوں کے پیدا ہونے کا امکان بھی نہ تھا، جب کہ یہ آیات موجود تھیں کہ هوالاول والآخر والظاهر والباطن، یا وللہالمشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ ان اللہ واسع علیم۔ ایسی تعلیم کے ہوتے ہوئے مسلمان عقیدۂ وحدت الوجود سے بال بال بچ گئے۔ لیکن ذات باری کا یہ تصور انسان کو اپنے خالق سے ملا دیتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا اُس کے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔

---

(۵۳) اننی انا اللہ لآ الٰہ الا انا فاعبدونی واقم الصلوٰۃ لذکری (۲۰)
(طٰہٰ : ۱۴)
(بے شک میں ہی خدا ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تم میری عبادت کیا کرو اور میری یاد کے لیے نماز پڑھا کرو)۔

ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدًی ولا کتابٍ منیر (۲۲)
(الحج : ۸)

(اور لوگوں میں بعض ایسا بھی ہے جو خدا (کی شان) میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے)۔

ھو اللہ الخالق البارئ المصوّر لہ الاسماء الحسنیٰ ط یسبح لہ مافی السماوات والارض ط (۵۹)
(الحشر : ۲۴)

(وہی خدا (تمام مخلوقات کا) خالق ایجاد و اختراع کرنے والا، صورتیں بنانے والا، اس کے سب اچھے اچھے نام ہیں)۔
(جو چیز آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کی تسبیح کرتی ہے)۔

اگرچہ انسانی عقل خدائے تعالیٰ کی ذات کا، جو لطیف و مجرد ہے، احاطہ نہیں کر سکتی، لیکن اس زاویۂ نظر سے اس کا احساس قرب، دعا سے حاصل ہوسکتا ہے۔ قرآن کی آیات سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی قلب میں رہتا ہے اور اس کے خیالات اور جذبات میں سمایا ہؤا ہے۔ اللہ کی عبادت انسان کا فرض ہے، وہ انسان کی شہ رگ سے بھی بہت زیادہ قریب ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم تفکر سے کام لیں، تاکہ اُس کی رحمتوں سے فیضیاب ہو سکیں۔ (۵۵)

اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ اللہ اور اُس کے فرشتے انسان پردرود بھیجتے ہیں تاکہ وہ تاریکیوں سے نکل کر نور کی طرف آجائے ھوالذی یصلی علیکم وملائکتہ لیخرجکم من الظلمات الی النور (۵٦) یہاں خدا کی قدرت کاملہ کا نفاذ مقصود نہیں بلکہ اس سے مراد اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی نجات کا خواہاں ہے اور انسان اپنے ارادے میں مختار ہے۔ اللہ صرف اُسے نیکی کی دعوت دیتا ہے اور اُسے دین کی راہ پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ اب آگے انسان کو اختیار ہے وہ جونسی راہ چاہے اختیار کرے۔

حکمت اور منشائے الٰہی ہر لحظہ اس کائنات پر حاوی ہے۔ ہمیشہ اس کائنات کی اصلاح و بہبود میں مصروف ہے۔ (۵۷) مادی تغیر تدریجی سے ہستیوں کی تکمیل ہوتی ہے اور وہ حسن و کمال میں اللہ کے قریب تر ہوتی جاتی ہیں؛ اس ہستی کے ارتقا میں دو طرح کا عمل جاری ہے ایک بلندی کی طرف اور دوسرا پستی کی طرف۔ اسی طرح انسانی فطرت کے رجحانات کے بھی دو پہلو

---

(۵۵) ونحن اقربُ الیہ من حبل الورید (۵۰)
(ق : ٦ :)
(اور ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں)۔
(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ الحدید آیات (۳–۲۱)۔
(۵٦) سورہ احزاب، ۴۳

(۵۷) قال ربنّا الذی اعطیٰ کُلَّ شیءٍ خلقہٗ ثُمَّ ھدیٰ (۲۰)
(طہ : ۵۲)
(کہا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی اور پھر اسے راہ دکھائی)۔

ھیں۔ وہ ادھر جائے یا اُدھر، تاھم اُسے ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک طرف راغب ھونے کا پورا اختیار حاصل ھے۔ انسانی نفس کی یہ دوگانگی دو وجہ سے ھے۔ ایک روح اور دوسرے شاکلہ یعنی قوت تشکیل جس کا قدرتی رجحان مادی حقائق کا حصول ھے اور یہ تباھی اور بربادی کی راہ ھے۔ (۵۸)

یہ روح جو عطیۂ الٰہی ھے اور جس سے انسان کو نوازا گیا ھے اُسے بلندی کی طرف لے جاتی اور اسی سے انسان عالم ارضی اور عالم روحانی کے مابین ایک ھستی بن جاتا ھے۔ یہ بلندی و پستی کے ڈانڈے اُسی کے وجود میں آکے ملتے ھیں۔ عقل جو نفس کی آلۂ کار ھے، اسی روح کی بدولت خارجیت اور ھمہ گیری (۵۹) حاصل کرتی ھے لیکن پورے طور پر اکتساب نور نہیں کرسکتی۔ اس کے لیے رحمت ایزدی اور توفیق الٰہی کا ھونا لازمی ھے۔ قرآن یہ بھی کہتا ھے کہ نفس اس عقل کے ھوتے ھوئے بھی خیر کی استعداد سے عاری ھے اور اس کا رجحان بدی کی طرف ھے۔ لیکن اس کا مقدر اسے خدا کی طرف لے جاتا ھے اور اسے نفس لوامہ بننے کی ترغیب دیتا ھے۔ اسی راہ پر چل کر انسانی عقل بالآخر عرفان الٰہی قبول کرنے کے قابل ھوجاتی ھے، طریقت کے مطابق پہلے تین مقامات نفس کے ارتقا کے ھیں (ا) اور باقی چار روح کے، (ب) جو رفتہ رفتہ نفس پر غالب آجاتی ھے اور اُسی نفس کی تمام مادی خواھشات و مقتضیات کا تزکیہ ھو جاتا ھے۔

---

(۵۸) وما اُبری نفسی ان النفس لَاَمّارةٌ بالسُّوءِ الّا ما رَحِمَ ربّی (۱۲) (یوسف: ۵۳)

(میں اپنے تئیں پاک صاف نہیں کہتا کہ نفس (امارہ تو انسان کو) تو برائی سکھاتا ھے مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے)۔

(۵۹) یہدی اللّٰہُ لِنُورِہٖ من یشاءُ (۲۴) (النور: ۳۵)

(خدا اپنے نور سے جس کو چاھتا ھے سیدھی راہ دکھاتا ھے)۔

(ا) امارہ، لوامہ، مطمئنہ

(ب) ناسوت، جبروت، ملکوت، لاھوت

راہ سلوک کے ان ساتوں مقامات کے نام بھی سوائے آخری مقام کے قرآن ھی سے لیے گئے ھیں (۶۰) یہ تصورات اس طرح کی آیات پر مبنی ھیں وجعل الظلمات والنور (انعام) اس سے عقیدۂ دوگانگی یا ثنویت واضح ھوتا ھے۔

ظلمات نور سے پہلے آتے ھیں ۔ قرآن نہایت اختصار وایجاز کے ساتھ جسمانی اور اخلاقی تکوینی کائنات کا ذکر کرتا ھے ۔ ایک اور جگہ آتا ھے سبحن الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض ومن انفسھم و مما لا یعلمون۔ (۶۱) اس لفظ ازواج سے مراد وہ عناصر ھیں جو دو ھستیوں یا دو چیزوں میں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ھیں۔ ضدین ھی کی باھمی آمیزش سے توافق کی تشکیل ھوتی ھے اور ھستی کی حرکت و رفتار متضاد عناصر کے امتزاج ھی کا نتیجہ ھے یہ خیال مزدی اور زرتشی خیالات کے بہت قریب ھے لیکن اسلام میں آگ جو جلتی ھے اور شعلہ جو حقیقت کو روشن کرتا ھے طبعی طور پر ایک دوسرے سے الگ نہیں ۔ ایک فرد جلنا چاھتا ھے یا منور ھونا چاھتا ھے اس کا انحصار خود فرد کی کیفیت رجحان پر ھے ۔

اس تجلی کو حاصل کرنے کے لیے نور یا تجلی پر ایمان کامل کا ھونا ازبس لازمی ھے، اس میں وہ فسادی تاریکیاں (ظلمات) جو انسان کے نفس میں جاگزیں ھیں اور جو کائنات میں بھی موجود ھیں خود بخود زائل

---

(۶۰) وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۷۵) (قیامت : ۲)

(اور نفس لوامہ کی بھی قسم (کہ سب لوگ اٹھا کر کھڑے کیے جائیں گے) ۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا ۝ فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا (۹۱) (شمس : ۷، ۸)

اور انسان کی اور جس نے اس (کے اعضا) کو برابر کیا، پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرھیزگاری کرنے کی سمجھ دی) ۔

یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (۸۹) (فجر : ۲۷)

(اے اطمینان پانے والی روح) ۔

(۶۱) (یٰسین : ۳۶)

ہو جائیں گی۔ ایک آیت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن کے قلب کو نورانی کر دیتا ہے۔(٦٢) اس لیے فلاح بہبود کا انحصار خدا اور آخرت پر ایمان لانے پر ہے۔ دوسری آیات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عبادت و صلوۃ (دعا) انسان کو بلندی کی طرف لے جانے کے لیے راغب کرتی ہے۔ اور اس سے اس دنیا میں سکون قلب اور آزادیٔ روح حاصل ہوتی ہے اور انسان بالآخر عالم بالا تک جا پہنچتا ہے۔ جب زندگی کے بلند منازل تک پہنچنا مقصود ہو تو تمام فرق مراتب جو انسانی زندگی اور قسمت سے وابستہ ہیں، مٹ جاتے ہیں۔

قرآنی عقیدۂ آخرت کے مطابق حیات بعد الموت پر ایمان اور زندگی کے تسلسل کو قائم رکھنے کا پختہ ارادہ، نفس کی زندگی و بقا کا لازمی جز ہیں۔ اس کے ضروری عناصر موت کے بعد آزاد ہوکر روح کے زیر سایہ اپنی ہستی قائم رکھتے ہیں۔

اسلام میں خدا ہی سب کچھ ہے، وہی معبود حقیقی ہے، وہی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ قیامت کے دن وہی بچانے والا ہے۔ انبیاء اور رسل محض اس کے بھیجے ہوئے پیغامبر ہیں اور ان کا کام فقط اللہ کے فرمان کے مطابق انسانوں کو ڈرانا یا بشارت دینا ہے۔ اگرچہ وہ بےحد محترم ہیں، لیکن وہ بشر ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ اُن کی ذات ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ پیش کرتی ہے۔ ہم اُن کے لیے دعا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور سلامتی کی التجا کرتے ہیں۔ ہم اُن کے روحانی کمالات کو اس لیے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ہمیں بھی وہ بصیرت اور تجلی حاصل ہو۔ اس سے انحراف کرنا قرآنی تعلیمات کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن کسی فرشتے یا بزرگ کو مربی یا محافظ ماننے سے روکتا ہے۔ دین انبیاء

---

(٦٢) ومن یومنٌ باللہ یھد قلبَہٗ ط (التغابن : ١١) (٦٤)

(اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے، وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے)۔

اور کتب سے قدیم تر ہے۔ (٦٣) اس لیے دین کو موسویت، عیسائیت یا محمدیت کے نام سے تعبیر کرنا صریحاً اسلامی سپرٹ کے منافی ہے۔

خدا تمام پہلے اور موجودہ کے ایمان لانے والوں کو مسلمین کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ اسی اسلامی سپرٹ کے ماتحت جس کی معنوی وسعت کو محض نزول قرآن کے عہد تک محدود نہیں رکھا جا سکتا، یہ لفظ پکار پکار کر کہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی امتیاز مذہب و ملت کے اُن تمام بندوں پر اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے جو اس کی پرستش کرتے ہیں، آخرت پر ایمان لاتے اور نیک کام کرتے ہیں۔ (٦٤)

قرآن کہتا ہے کہ انسان کا علم صرف سطحی ہے، گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو اس سطح سے اُتر کر اشیاء کی گہرائی تک جانا چاہیے اور اُن کے حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن یہ بھی

---

(٦٣) وما كان ابراهيمُ يهوديّاً ولا نصرانياً ولٰكن كان

(٣)
حنيفاً مسلماًؕ وما كانَ من المشركين ۔ (آل عمران : ٦٧)

(ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی، بلکہ سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہو رہے تھے اور (اسی کے) فرمانبردار تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے)۔

(٦٤) ان الذين اٰمنوا والذين هادوا والنصارىٰ والصّابئينَ

مَن اٰمنَ باللہ واليوم الاٰخر وَعَمِلَ صالحاً فَلَهُم اَجرُهم عند

(٢)
ربهم ۚ وَلا خوف عليهم ولا هم يحزنون (البقرہ : ٦٢)

(جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست (یعنی کوئی شخص کسی قوم و مذہب کا ہو) جو خدا اور روز قیامت پر ایمان لائے گا اور عمل نیک کرے گا تو اُن کو اُن (کے اعمال) کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا اور (قیامت کے دن) اُن کو نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہونگے)

کہتا ہے کہ انسان بذات خود عجائب و غرائب کا خزانہ ہے - (۶۵)

یہیں آ کر علم باطن یا تصوف کی حد شروع ہوتی ہے جسے ہمیشہ اسلام کی تعلیمات کے منافی سمجھا جاتا رہا۔ پیغمبر اسلام کے بارے میں لوگوں کا یہی عقیدہ رہا کہ وہ ارباب ظاہر سے تھے اور آن کی ذہنی ساخت میں سب سے نمایاں عنصر آن کی روشن دماغی تھی۔ اس بات کو نظر انداز کردیا گیا کہ وہ برسوں حق و صداقت کی جستجو میں ترک نفس وریاضت کی راہ میں گامزن رہے ۔ پھر کہیں جا کر نبوت کے مقام اعلیٰ پر پہنچے ۔ (۱)

دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی جبریہ عقیدے کا پہلو موجود ہے جو بظاہر انسانی اختیار و قدرت کی—جس پر قرآن جا بجا زور دیتا ہے—ضد معلوم ہوتا ہے ۔ عیسائیت کے ابتدائی دور میں یہ مسئلہ شدید بحثوں اور معرکوں کا مرکز بنا رہا اور اسلام کے آتے ہی اس میں ازسرنو سرگرمیاں پیدا ہو گئیں ۔

رفتہ رفتہ اسلامی دنیا میں دونوں عقیدے سرایت کر گئے ۔ ایک طرف انسان کے ذاتی اختیار کو مان لیا گیا اور آسی شدت اور قطعیت کے ساتھ انسانی زندگی اور کائنات پر تقدیر کے شدید اثر کو بھی تسلیم کر لیا گیا ۔

چونکہ قضاوقدر کے وجود کو ہستیٔ انسان سے پہلے تسلیم کیا جاتا ہے، اس لیے اُسے سلسلۂ علت و معلول پر جو واقعات و حادثات کا مایہ و خمیر ہے اولیت و فوقیت حاصل ہے، اور اس سے انسانی اختیار کی تنقیض لازم آتی ہے انسانی اختیار ایک خارجی حقیقت ہے، جس کا دائرۂ عمل وسائل و حالات تک محدود ہے اور جس کے نتائج محسوس کیے جاسکتے ہیں ۔ بظاہر یہ اختیار و ارادہ قضا و قدر کے عام غیر مرئی اثر سے محفوظ رہتا ہے چنانچہ مؤخرالذکر کے وجود کو تسلیم کر لینا ایک دینی عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل

---

(۶۵) و فی الارض آیاتٌ للموقنین ٥ وَ فی آنفسکُم افلا تبصرون (۵۱)
(ذاریات : ۲۰، ۲۱)

(اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں ۔ اور خود تمہارے نفوس میں ۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں ؟)

(۱) مگر یہ شے وہبی ہوتی ہے ، کسبی نہیں (مترجم) ۔

شے یہی انسان کا ذاتی اختیار ہے جسے اگر زندگی کے خارجی واقعات سے الگ بھی کر لیا جائے تو بھی اس کا ظہور ہر جگہ اور ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ علاوہ بریں آزادیٔ اعمال اور مستقبل کا غیر متعین ہونا دونوں خلقت عالم کے قرآنی اصول کی بنیاد ہیں، جس کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ توریت و انجیل کا بیان ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل و صورت میں پیدا کیا ہے۔ اسلامی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ اس لیے ارادہ و اعمال پر قادر ہونا جو صفات الٰہیہ میں شامل ہیں، انسانی صفات سے خارج نہیں کی جاسکتی۔ اس مسئلے پر علماے اسلام کے اس گروہ نے بھی جو تقدیر کے قائل تھے اپنا سر جھکا دیا اور اس بات کو تسلیم کر لیا کہ آزادیٔ اعمال اخلاقی ذمہ داری کی ایک لازمی شرط ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے تقدیر کا مسئلہ جسے بعض اوقات اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب کے مقابلے میں کسی خاص بنیادی اصول کی حیثیت نہیں رکھتا۔

انسان میں جسے قرآن خلیفۃ اللہ کے نام سے یاد کرتا ہے، وہ قویٰ موجود ہیں جن کے بل پر وہ خود سوچ سمجھ کر عمل کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس کی تائید بہت سی آیات سے ہوتی ہے اور قرآن خلق آدم کا ذکر کرتے ہوئے بار بار انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کو نمایاں کرتا ہے۔

انسان کے اس مادی زندگی میں تنزل کر جانے کی قرآنی تمثیل نہایت قابل غور شے ہے۔ قدیم ترین روایات کی مطابقت کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو خاک سے پیدا کیا اور پھر اس کی تکمیل کے بعد اس میں اپنی روح پھونکدی، جس سے انسان میں ادراک و احساس و امتیاز کی قوت پیدا ہو گئی اور وہ بذات خود ایک مکمل شخصیت کا مالک بن گیا۔

اس مکمل ہستی کو جس کا تصور توریت و انجیل میں پیش کیا گیا ہے، خدا اپنا خلیفہ فی الارض کہہ کر پکارتا ہے۔ چنانچہ ملائکہ کو اسے سجدہ کرنے کا حکم ہوتا ہے اور وہ سب کے سب فرمان الٰہی بجا لاتے ہیں، سوائے ابلیس کے جو اس بنا پر انکار کرتا ہے کہ میرا مرتبہ انسان سے ارفع ہے، اسلیے کہ میری خلقت ناری ہے اور انسان خاک کا پتلا ہے اور اس کی حیثیت محض اس حیوان کی ہے جسے عقل عطا کی گئی ہو۔ انسان کی روحانی خلقت

کا یہی غلط تصور تھا جو گناہ و شر کے معرض وجود میں آنے کا باعث ہؤا۔

اہل شریعت بسا اوقات الہام کو لفظی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس طرح تمثیلات کے اساسی اور بنیادی معانی کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن تصوف کی تعلیمات اپنی روایات کی رو سے اُن تمام تاویلات کو تسلیم کرتی ہیں جو خارجی حقائق کے قریب تر ہیں اور اس بارے میں قرآن کی دیگر آیات تائید میں پیش کرتی ہیں۔ صوفیاے کرام کی روحانی زندگی کے تصور کے لیے تصوف کے ان عقائد کا جاننا ازبس لازمی ہے جو دنیاے اسلام میں مروج ہیں۔ ارباب تصوف کی نگاہ میں گناہ اول کی قرآنی تمثیل کے حقیقی معانی کچھ اور ہیں۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ ملائکہ سے طبع انسانی کے قواے اخلاقی مراد ہیں (۱)۔ ان قویٰ کا سرچشمہ بھی خدا ہی ہے، اس لیے کہ وہی ہر طرح کی قدرت کا سرچشمہ ہے۔ ملائکہ کا آدم کو سجدہ کرنا گویا انہی قویٰ کا اس کی قوت ارادی کے مقابل جھک جانا ہے۔ شیطان سے جسے توریت میں سانپ کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے اور جس کی خلقت نار سے ہوئی ہے، فی الحقیقت انسان کی نفسانی خواہشات کی آگ مراد ہے جو اسے جلا دیتی ہے اور اس آگ سے محفوظ رہنے کے لیے ایمان میں پناہ لینا ضروری ہے۔

اسی طرح شجر ممنوعہ سے مراد جسمانی غذا ہے، پیشتر اس کے کہ وہ فضلہ کی صورت اختیار کرلے یعنی نفس پرستی یا خود پرستی کا عنصر بن جائے۔ گناہ اس وقت معرض وجود میں آتا ہے جب ثنویت پیدا ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفس بجائے اللہ تعالیٰ کی وحدت میں کھو جانے کے اپنی اصل حالت کو کھو دیتا ہے۔

اسی صورت کا اظہار جس کا تعلق خدا کی ذات یا اُس کے منشا سے ہے، انسان کی ذات میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ان قواے انسانی میں خارجی طور پر عمل پیرا ہونے کی استعداد موجود ہوتی ہے اور وہ خصائص طبعی کے اعتبار سے کبھی انسان کے مخالف اور کبھی موافق ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک کی آخری سورت اس کی وضاحت یوں کرتی ہے۔

---

(۱) بوالبشر را قویٰ ملائکہ اند جزو و کل هست در سجود اینجا
(نظیری) ،مترجم

کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں (یعنی) لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی (شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے، جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے (خواہ وہ) جنات میں (ہو) یا انسانوں میں سے۔ (ا)

قرآن کو کلام الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جو روح القدس کے ذریعے آنحضرت پر نازل ہؤا اور اس سے مقصود یہ ہے کہ انسانوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لایا جائے، یہ پیغام الٰہی لانے والا فرشتہ جسے روح القدس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، وہی ہے جس کا ذکر عیسائیت کے عقیدۂ تثلیث میں موجود ہے۔

سورۂ بقرہ میں حضرت عیسیٰ کا ذکر یوں کیا گیا ہے: وآتینا عیسیٰ ابن مریم البینات و ایدناہ بروح القدس (آیۃ ۲۵۳) اسی طرح سورہ نحل میں نبی صلعم سے خطاب ہوتا ہے کہ قل نزلہ روح القدس من ربک (آیتہ ۱۰۲)۔ پھر حضرت مریم کے حاملہ ہونے پر ارشاد ہوتا ہے فنفخنا فیھا من روحنا (سورۂ انبیا آیتہ ۹۱)۔ اسی طرح بشر کی خلقت پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین (سورہ ص آیتہ ۷۲) ان تمام آیات میں لفظ روح استعمال ہؤا ہے۔

مسلمان مفسرین روح سے مراد جبرئیل لیتے ہیں۔ قرآن اس چیز کی کافی وضاحت نہیں کرتا کیونکہ وہاں روح کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روح امر ربی کا نتیجہ ہے اور وہ انسانی فہم سے بالا ہے۔ (ب)

ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ روح اور وحی ایک ہی شے ہیں کذالک اوحینا الیک روحا من امرنا (سورہ شوریٰ آیۃ ۵۲)

اگر ان تمام متفرق آیات کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ روح ذات الٰہی کا ہی ایک عنصر ہے۔ آولئک کتب فی قلوبھم الایمان

(ا) سورہ الناس

(ب) تاہم یہ درست ہے کہ یہ دونوں لفظ جبرئیل اور روح ایک دوسرے سے الگ تھلگ مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ عربی کا لفظ جبر عبرانی کے ایک لفظ کے مترادف ہے، جس کے معنی قوی اور طاقتور کے ہیں۔ چنانچہ سورۂ نجم میں علمہ شدید القویٰ سے جبرئیل ہی مراد لی جاتی ہے۔ (مصنف)

ایدھم بروح منه (سورہ مجادلہ آیۃ ۲۲)

قرآن مجید کے کئی ایک باب ھیں جنھیں سورتیں کہا جاتا ہے۔ یہ سورتیں وھی ھیں جو بیس سال کے اندر مختلف اوقات میں جمع ھوتی رھیں۔ قرآن کی بعض عبارتوں سے ایسا ظاھر ھوتا ہے کہ اس کلام الہی کی ابتدا لیلۃ القدر سےھوئی اور یہ وھی رات تھی جب آنحضرت پر سب سے پہلی وحی نازل ھوئی۔ بعض آیات میں اس بات کی صاف وضاحت مو جود ہے کہ قرآن رمضان کے مہینے میں قدر کی رات ھی کو نازل ھؤا۔ (٦٦) اس رات فرشتۂ غیبی سب سے پہلے پیغمبر کے رو برو آیا۔ چنانچه انا اعطیناك الکوثر . . . الخ (اسی کی طرف اشارہ کرتے ھیں) - اس نظریہ کی رو سے یہ چیز بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ مسلمان علما کی ایک جماعت کس لیے یہ سمجھتی رھی کہ خود قرآن کے اندر وہ قرآن موجود ہے جو ایک ھی رات میں نازل ھؤا اور باقی ماندہ کتاب حالات و ضروریات کے مطابق وحی اور الہام کی مدد سے جمع ھوتی چلی گئی۔ گویا اس تفسیر کی رو سے پہلا الہام یا پہلی رات کا نازل شدہ قرآن ایک سر چشمه تھا جس سے یہ ھدایت کا دریا پھوٹ نکلا۔

قرآن میں کئی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں اخلاقی قوانین بھی ھیں اور معاشرتی اور دینی مشورے بھی۔ اس میں فقہی نظام کی تعمیر اور شرعی اصولوں کی وضع و ترتیب کے لیے پورا پورا مواد موجود ہے۔ اس میں ایسے قواعد بھی ھیں جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رھنمائی کر سکتے ھیں۔ اس میں ایسے معلومات بھی ھیں جنھیں علم موجودات اور مبحث آخرت کا مخزن کہا جا سکتا ہے۔ کہیں کہیں تاریخی اور دینی مباحثات ھیں۔ قرآن میں ان واقعات کا بھی ذکر ہے جن کا ظہور اسلام کے ابتدائی دور میں ھؤا۔ ان واقعات سے پته چلتا ہے کہ مسلمانوں کو شروع شروع میں کن کن حادثات کا سامنا کرنا پڑا اور ان انقلابات و حوادث کی تاریخی اھمیت کیا تھی۔ انھی واقعات کے ساتھ ساتھ وہ خدائی بشارت و تہدید بھی موجود ہے جس کا ذکر توریت میں بھی آتا ہے۔

---

(٦٦) انا انزلناه فی لیلۃ القدر (قدر : ۱)

(ھم نے اس (قرآن کو) شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا۔)

بعض سورتوں میں انبیاء کے حالات اور اُن کے مختلف مذاہب اور اخلاق کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ ان حالات سے جو اخلاقی تعلیات ہمیں ان پیغمبروں کے بارے میں ملتی ہیں، توریت و انجیل کے صفحات اُن سے بالکل عاری ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مسلمان تمام انبیا کو یکساں قابل احترام سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ سب کے سب نور ایزدی سے فیضیاب تھے۔

قرآن اپنی زبان اور ادبی انداز بیان میں قدیم عربی کے اصول صرف و نحو اور فصاحت کی سختی سے پابندی نہیں کرتا۔ عبارت میں کبھی کبھی مفرد کی جگہ جمع اور جمع کی جگہ مفرد استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح صیغۂ غائب کی جگہ مخاطب یا متکلم آجاتا ہے۔ محذوفات و مقدرات کی بھی کثرت ہے۔ ان حالات میں معانی کی توضیح کے لیے تفسیر کی ضرورت پڑتی ہے۔

پولیکی (۱) اور مارکیونی (۲) نظریات کی بنیاد اس عقیدہ پر تھی کہ خدا کے مقابلے میں ایک اور طاقت بھی ہے۔ وہ شر کا خدا یا بدی کا دیوتا ہے۔ تمام باغی فرشتے اُس کے خدمت گزار ہیں۔ مسیح کے عقیدے نے آکر ان نظریات کو رفتہ رفتہ دبانا شروع کر دیا۔ ان عقائد کا تنزل ایک خاص

---

(۱) Paulician : پالیکی فرقہ کا رکن ــ اس فرقے کی بنیاد ساتویں صدی عیسوی میں آرمینیا میں رکھی گئی تھی۔ اس فرقے کے عقائد کم و بیش وہی تھے جو مانوی فرقے کے تھے۔ مانوی فرقے کا بانی تیسری صدی عیسوی میں ایران میں گزرا ہے۔ اس کے عقائد میں لاادریت، عیسائیت اور مزدیت کے عناصر شامل تھے اور وہ خدا کے وجود کے ساتھ شیطان کے وجود ابدی کا قائل تھا۔

(۲) Marcionite : فرقۂ مارکیونی کا رکن ــ اس فرقے کی دوسری صدی عیسوی میں بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس فرقے کے بانی کا نام مارکیون تھا (Marcion) وہ سینٹ پال کے دس رسائل اور لوقا کی مسخ شدہ انجیل کا معتقد تھا اور اُس کا خیال تھا کہ کائنات ایک ایسے خدا کی بنائی ہوئی ہے جو کامل نہیں۔

وقت سے شروع ہوتا ہے - لیکن ایسے عقائد اسلام میں کبھی داخل نہ ہو سکے - اسلام میں توحید کا تصور نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم رہا - وہ بنیادیں خود اللہ تعالیٰ کی ذات سے وابستہ رہیں ، ایسی ذات جو قدرت کاملہ کی حامل ہے اور اپنے آپ میں ہر طرح کامل ہے - اس عقیدۂ توحید میں کسی طرح کے فلسفیانہ تصورات کا ، وہ فلاطونی ہوں یا کوئی اور ، شائبہ پیدا نہ ہو سکا - اس لیے تمام پیغمبر جو یکے بعد دیگرے بنی نوع انسان کے لیے خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے رہے ، سب کے سب قرآنی نقطۂ خیال سے ایک اور صرف ایک ہی پیغام کو لاتے رہے اور وہ پیغام حق و صداقت کا اٹل اصول تھا جو ہر زمانے اور ہر دور میں یکساں ہوتا ہے -

اسلام چار جلیل القدر پیغمبروں ، حضرت ابراہیم ع ، حضرت موسیٰ ع ، حضرت عیسیٰ ع اور حضرت محمد صلعم کو تسلیم کرتا ہے جنھیں اولوالعزم کہا جاتا ہے - یہ لفظ بھی قرآنی ہے - ان چاروں پیغمبروں کی شخصیت اور عظمت مساوی ہے ، اس لیے کہ اُن سب کے عقائد اور تعلیم ایک جیسی تھی -

سورۂ آل عمران میں محکمات اور متشابہات کے باہمی امتیاز و تفریق کو واضح کیا گیا ہے - محکمات سے وہ آیات مراد ہیں جن کے معانی لغوی اور حقیقی ہیں - متشابہات ایسی آیات ہیں جو استعارے کے رنگ میں بیان کی گئی ہیں اور اس لیے اُن کی وہ حیثیت نہیں جو محکمات کی ہے - بعض آیات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ضرورت و اقتضا کے مطابق بعض آیات کو بعض دوسری آیات کے ذریعے بدلتا اور اُن میں تصرفات کرتا ہے - خود آنحضرت کی زندگی میں ساٹھ آیتیں ایسی تھیں جنھیں منسوخ کر دیا گیا - بعض ایسی بھی تھیں جو ضروریات کے ختم ہونے پر منسوخ ہو گئیں - (۱)

قرآن کی ترتیب و تدوین کا کام پیغمبر کی وفات کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابو بکر رض نے شروع کیا - اس کی تکمیل تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رض نے کی - اس ترتیب و تدوین میں خاص احتیاط سے کام لیا گیا - سورتوں اور پاروں کی ترتیب وہی رہی جو تھی اور اُن میں کسی طرح کے منطقی یا

(۱) مصنف کا یہ بیان قابل قبول نہیں اس لیے کہ اس بارے میں علماء کا شدید اختلاف موجود ہے — (مترجم) -

تاریخی تسلسل پیدا کرنے کی کوشش نہ کی گئی اور نہ ہی اُن میں کوئی تغیر و تبدل ہؤا ۔ چنانچہ اُس کی موجودہ صورت بالکل وہی ہے جو اُس وقت تھی ۔

پس آنحضرت ؐ کے سوانح حیات کے لیے خود قرآن مجید سے بڑھ کے اور کوئی مستند یا معاصرانہ تاریخی مواد نہیں ہو سکتا ۔

آنحضرت ؐ کے سوانح عمری لکھنے کا کام اُن کی وفات کے نصف صدی بعد شروع ہؤا ۔ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ بعض تازہ ترین واقعات کو بھی بیان کرنے والے کس طرح غلط بیانی سے کام لیتے ہیں یا ارادتاً اُن واقعات کی صورت کو مسخ کر دیتے ہیں ۔ پس اُن بیان کردہ واقعات کی تاریخی حیثیت کیا ہوگی جو مختلف ممالک اور مختلف اوقات میں لکھے گئے اور ایک ایسی ہستی کے متعلق لکھے گئے جس نے اپنے عہد کے تمام عقائد کو یکسر بدل دیا تھا اور جس کے اگر دوست تھے تو دشمن بھی تھے ۔

مغرب میں نبی صلعم اور اُن کے کام کی تخفیف کرنے والوں کی کمی نہیں ۔ جوں جوں لوگوں میں دقت نظر پیدا ہوتی چلی گئی ، نقادان تاریخ بھی واقعات کو اصلی رنگ روپ اور خارجی ماحول میں دیکھنے کے عادی ہوتے چلے گئے ۔ برعکس اس کے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمان مؤرخوں کی سیرۃ نگاری میں مدح و ستائش کا عنصر غالب تھا ۔

اس لیے ہم کوشش کریں گے کہ اس بارے میں جو لکھا جائے وہ بغیر کسی عصبیت کے ہو اور آنحضرت ؐ کی زندگی کے صحیح خط و خال کو واضح کرتا ہو ۔

آنحضرت ؐ کی زندگی اگرچہ عظیم الشان نتائج اور محیر العقول واقعات کا سرچشمہ تھی ، لیکن اُس میں سادگی اور استقامت کا رنگ نمایاں تھا ۔ آپ کی طبیعت تلون اور وسوسوں سے پاک تھی ۔ آپ کو معلوم تھا کہ میرا نصب العین کیا ہے ؟ اور اس نصب العین کے حصول کے لیے آپ براہ راست کوشاں رہتے تھے ۔ آپ کی زندگی کی ممتاز خصوصیات یہ تھیں کہ آپ زندگی کے حقائق کو خوب سمجھتے اور احاطہ کر سکتے تھے ۔ اسی مطمح نظر کا عکس آپ کے افعال میں نظر آتا ہے ، وہ افعال جو حیات انسانی کے عام سطح و معیار سے بہت بلند تھے ۔

غیر معمولی ذہانت ، یقین محکم اور عزم بالجزم کی بدولت آپ اُن تمام مشکلات و موانع سے عہدہ برآ ہوتے چلے گئے جو آپ کی راہ میں حائل ہوئیں ۔

روز مرہ کے معاملات میں آپ کی صداقت اور صاف گوئی کے باعث عالم جوانی ہی میں قوم نے آپ کو امین کا لقب دیا تھا ۔ ذہنی اور قلبی صفات کے ساتھ ساتھ جو آپ کو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی تھیں ، آپ میں غیر معمولی جسمانی اوصاف بھی پائے جاتے تھے ۔ غرض آپ کی ذات ہمہ تن ارشاد و تلقین بھی تھی اور سراپا محبت و احترام بھی ۔

زہد و اتقا کا عمیق احساس آپ کی روحانی زندگی کا آئینہ دار تھا ۔ گویا آپ کی ذات زبان حال سے قرآن مجید کے یہ الفاظ دہرا رہی تھی : ان صلوتی و نسکی و محیائی و مماتی للہ رب العالمین ۔ (قدرت نے آپ کو تیرہ سو سال پہلے خلق خدا کو اُس راہ مستقیم پر لانے کے لیے منتخب کیا جس پر آج کروڑوں انسان گامزن ہیں ۔

نبی صلعم اس عالی مرتبہ ہاشمی خاندان کے چشم و چراغ تھے جن کا سلسلۂ نسب براہ راست حضرت ابراہیم ع کے فرزند اسمعیل ع سے ملتا ہے ۔

دوسرے ہموطنوں کی طرح جو تلاش معیشت کی غرض سے دوسرے ممالک میں تجارت کرنے جایا کرتے تھے ، آپ نے بھی بہت سے علاقوں اور بالخصوص شام کے سفر کیے ۔ آپ کی پہلی زوجہ خدیجہ رض تھیں جو مکہ کی ایک متمول خاتون تھیں ۔ آپ نے اُن کے ساتھ اپنی زندگی کے کئی سال آرام اور خوشی سے گزارے ۔ جب آپ کو چالیس برس کی عمر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہؤا اور نبوت کا منصب سپرد کیا گیا تو سب سے پہلے ایمان لانے والی بھی وہی تھیں ۔

عنفوان شباب میں سقراط کی طرح آپ میں ایک نیک شہری کی تمام صفات پائی جاتی تھیں اور آپ نے بدوی رہزنوں کے خلاف لڑائی کے وقت ایک بہادر سپاہی کے جوہر بھی دکھائے تھے ۔ یہی سپاہیانہ جوہر غزوات میں آکر اور بھی چمکے اور آپ یوشع نبی ع کی طرح ایک قابل سالار لشکر ثابت ہوئے ۔ آپ کو اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ تھا اور طبیعت میں سکون اور خود اعتمادی تھی ۔ یہی اوصاف آپ کے پیروکاروں کے دلوں میں اتر گئے

تھے ۔ جہاں کہیں مشکلات کا سامنا ہوتا اور مایوسی اور ناامیدی منہ دکھاتی تو آپ کی ہمت اور بھی استوار اور آپ کے ارادے پہلے سے زیادہ پختہ ہو جاتے ۔ جب فتح حاصل ہوتی تو آپ کا دل سخاوت و مروت کے جذبات سے لبریز ہوتا ، لیکن جہاں آپ کے نصب العین کے تحفظ کا سوال پیدا ہو جاتا ، وہ عدل و انصاف کا مجسمہ بن جاتے تھے ۔ اپنی روز مرہ گھریلو زندگی میں آپ ایک سادہ ، منکسر مزاج اور خلیق انسان تھے اور دنیوی معاملات میں بڑے دانش مند اور دور اندیش ۔

حضرت خدیجہ رض کی وفات کے بعد آپ نے زمانے کے رواج اور قدیم پیغمبروں کے دستور کے مطابق اور شادیاں بھی کیں ۔ ان میں بعض حالات کے اقتضا اور معاشرتی ضروریات کا نتیجہ تھیں ، لیکن حضرت خدیجہ رض کی مقدس اور عزیز یاد ہمیشہ آپ کے دل میں تازہ رہی ۔

کہا جاتا ہے کہ وہ اُمی تھے ، لیکن جوانی میں آپ کو بہت سے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہؤا جن سے یقیناً آپ نے استفادہ کیا ہوگا ۔ پچیس برس کی عمر کے بعد آپ اکثر مکے کی پہاڑیوں کے غاروں میں تنہا بیٹھ کر عبادت و تفکر میں مصروف رہا کرتے تھے ۔ اگرچہ آپ کے ہمعصروں میں اس راہ حنیف کے اور بھی متلاشی تھے ، لیکن خدا کے برگزیدہ اور محبوب ازلی ہونے کا سہرا آپ ہی کے سر رہا ۔

ساتویں صدی عیسوی کے ابتدا کا زمانہ انتہائی اخلاقی پستی کا زمانہ تھا ۔ فسق و فجور حد سے تجاوز کر چکے تھے ۔ بے دینی کا دور دورہ تھا ۔ مکروہ اور وحشیانہ رسم و رواج نے معاشرتی نظام کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں ۔ پاکیزہ اور حساس طبائع خبث و شر کے اس اُمڈتے ہوئے طوفان سے پناہ ڈھونڈھ رہی تھیں ۔

عرب کے لوگ مختلف قبیلوں اور فرقوں میں بٹ گئے تھے اور آن میں باھمی جنگ و جدال کا بازار گرم تھا ۔ یہود، نصاریٰ اور مشرکین ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے ۔ یہ پیہم خانہ جنگیاں ان لوگوں کے دینی تعصبات اور قبائلی تصادم کا خاتمہ نہ کر سکیں ۔ سیاسی مرکزیت کا نام و نشان تک نہ تھا ۔ اسی فضا میں رسول اکرم ص نے جنم لیا ۔ حالات کی یہی ابتری ایک نئے معاشرتی اور دینی نظام کے معرض وجود میں آنے اور اس کے پھلنے پھولنے کا باعث ہوئی ۔ اور اسی سے لوگوں کے درمیان وہ

طبقۂ حنفاء پیدا ہؤا جن کے نزدیک نجات کا واحد ذریعہ وہی قدیم دین ابراھیمی تھا۔ یہ حنفاء حضرت ابراھیم علیہ السلام کو خانۂ کعبہ کا بانی اور اُن کے بیٹے اسمعیلؑ کو اپنا جد اعلیٰ مانتے تھے۔ یہ جماعت جس کے خود نبی صلعم ایک فرد رہ چکے تھے، یہود و نصاریٰ کے بنیادی اختلاف کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ وہ نہ تو تثلیث کے قائل تھے اور نہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں یہودیوں کے عقیدے کے حامی۔ وہ ان دونوں عقیدوں میں سے کسی کے بھی ہمنوا نہ ہو سکتے تھے، کیونکہ یہ دونوں عقیدے ان کی نظر میں دین کے مقابلہ میں الحاد کا حکم رکھتے تھے۔

اس جماعت نے اپنے دین کا نام ''دین قیم'' رکھا۔ یعنی ایسا دین جو اساسی اور اٹل ہے۔ اسلام کا لفظ جس کے معنی 'سلامتی اور نجات کی راہ' ہیں۔ ان لوگوں میں پہلے سے رائجؔ تھا۔ قرآن نے اسی لفظ کو استعمال کیا اور اس راہ پر چلنے والے کو 'حنیف' کے لقب سے یاد کیا، یعنی ایک اور صرف ایک ہی خدا کو ماننے والا۔

ایسے لوگوں کی تعداد بہت تھی، مگر وہ عرب کے مختلف گوشوں میں بکھرے پڑے تھے۔ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اُنھیں ایک مرکز پر لا سکتی۔ اس وقت ایک ایسی برگزیدہ ہستی کی ضرورت تھی جسے تائید غیبی حاصل ہوتی اور جو اُنھیں ایک مسلک پر جمع کر سکتی اور ایک مرکز پر لا کر اُنھیں دینی اور معاشرتی عزو وقار عطا کرتی اور اُنھیں اس بلندی پر لے جاتی جہاں یہودی اور نصرانی دین کی حدیں ملتی تھیں۔ عرب مؤرخین کے خیال کے مطابق عرب کے لوگ نہایت بے تابی سے ایسے مسیح کے آنے کا انتظار کر رہے تھے اور لوگوں کی نظریں ان آیات و نشانات پر لگی ہوئی تھیں جو خدا کے بھیجے ہوئے رسول کی آمد آمد کی بشارت دے رہے تھے۔ یہ برگزیدہ ہستی، یہ خدا کا بھیجا ہؤا رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔

ایک رات جب آپ تفکر و عبادت میں محو تھے، آپ نے اُفق پر ایک نورانی جلوہ دیکھا، جسے قرآن کے نام سے یاد کرتا ہے اور آپ سہم گئے۔ یہ چیز آسمان کی طرف سے زمین کی طرف آئی اور آپ کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آپ میں سما گئی۔ دو سال کے بعد وحی پھر نازل ہوئی اور آپ کو تلقین کی گئی کہ آپ انسانوں کو خدائے واحد و لاشریک کی

عبادت کرنے کی ہدایت کریں۔ یہ واقعات قرآن پاک کے سورۂ النجم (آیات ۱-۱۸) اور سورۂ التکویر (آیات ۱۹-۲۳) میں درج ہیں۔

ان دونوں موقعوں پر جو احکام نازل ہوئے، وہ سورۂ التحریم اور سورۂ الملک کے آغاز میں موجود ہیں۔ آپ نے ان احکام کو لوگوں تک پہنچایا اور تھوڑے ہی عرصے میں دنیا نے آپ کی آواز پر لبیک کہا اور اسلام لانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ مکے کے امیر گھرانے اور دولت‌مند سوداگر جن میں سے بہت سے آپ کے قریبی رشتہ‌دار تھے، اس بات سے خائف ہوئے۔ شروع شروع میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق آڑاتے رہے، لیکن جب آپ کی کامیابی نے نمایاں صورت اختیار کر لی تو وہ دھمکیوں پر اُتر آئے اور آخرکار دائرۂ اسلام میں شریک ہونے والوں کو منظم طور پر ایذائیں دینی شروع کیں۔

یہ سلسلہ بارہ سال تک جاری رہا، یہاں تک کہ حالات بالکل ناسازگار ہوگئے اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا اور وہ مکے سے بھاگ کر مدینے اور دوسری بستیوں میں پناہ لینے لگے۔ خود نبی صلعم کو شہید کرنے کی کوششیں کی گئیں اور بالآخر آپ ۶۲۲ء میں مکے کو چھوڑ کر مدینے چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ یہ واقعہ تاریخ اسلام میں ہجرت کے نام سے موسوم ہے اور اسی سال سے سن ہجری کا آغاز ہوتا ہے۔ اب وحی کو نازل ہوئے بارہ سال ہو چکے تھے۔

جب تک آپ مکے میں رہے آپ حنفا کی ایک مختصر سی جماعت کے روحانی رہنما تھے۔ مدینے میں آ کر آپ اُن مہاجرین کی کثیر جماعت کے جو آپ کے ہمراہ ہجرت کر کے آئے تھے، دینی اور دنیوی سالار بن گئے۔ آپ کے پیروکاروں میں مدینے کے لوگ بھی شامل ہوگئے۔ اب آپ کی حیثیت ایک امیر کی تھی اور آپ ایک ایسی ریاست کے مالک تھے جس کے دینی اور سیاسی قانون خود قرآن نے وضع کیے تھے۔ رفتہ رفتہ اسلام نے ایک سیاسی ادارے یا جماعت کی صورت اختیار کر لی اور آپ اُس جماعت کے امیر اعلیٰ اور حاکم بن گئے اور اسلام کے قیام و دوام کے لیے یہ امر ناگزیر بھی تھا۔

آپ کا یہ دینی اور دنیوی اقتدار محض خدا کی ذات سے وابستہ تھا اور آپ کے سارے تفوق کی بنیاد نازل ہونے والی وحی پر تھی۔ یہ ایک روشن دلیل تھی جس کا عکس ہر مومن کی آنکھوں سے ہویدا تھا اور وہ

خدائے پاک و برتر کی موجودگی کو ہر لحظہ اپنے مابین محسوس کرتے تھے۔ وحی کے نازل ہونے کا سلسلہ جاری رہا اور واقعات کا ظہور ان کی تصدیق کرتا چلا گیا اور ساتھ ساتھ مومنوں کی رہنمائی بھی ہوتی رہی۔

مکے والوں کی چیرہ دستیوں اور کمین گاہوں سے آزاد ہوکر آپ نے مدینے میں اپنی طاقت مضبوط کر لی اور پھر اعلانیہ پیغام حق کی تبلیغ فرمانے لگے، تاہم اس عرصے میں گرد و نواح کے یہودی قبائل کی مزاحمت جاری رہی اور وہ لوگ تلقین و ارشاد سے راہ راست پر نہ آئے۔ اس کا نتیجہ شدید تصادم کی صورت میں رونما ہؤا اور اس تصادم و جنگ میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور رفتہ رفتہ انھیں وہ سیاسی اقتدار حاصل ہوتا چلا گیا جس نے تقریباً ایک صدی کے اندر ایک عظیم الشان سلطنت کی صورت اختیار کر لی۔ وہ سلطنت جو چین سے لے کر فرانس تک پھیلی ہوئی تھی۔

وفات سے کچھ عرصہ پیشتر آنحضرت ؐ مکے میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور یہاں کے لوگوں سے اخلاق اور حسن سلوک سے پیش آئے اور وہ سب کے سب دائرۂ اسلام میں آ گئے۔ خانۂ کعبہ اسلام کا دینی مرکز بنا اور مسلمان سرزمین عرب کے مالک بن گئے۔

آپ نے ۶۳۲ء میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۱ برس کی تھی۔ ایک بار آپ کو زہر دیا گیا تھا اور اس کے اثرات تاحین حیات باقی رہے۔ مرض الموت انھی اثرات کا نتیجہ تھا۔

وفات کے وقت یہ الفاظ آپ کی زبان پر تھے: ''اللھم الرفیق الاعلیٰ''

قرآن کی بہت سی آیات میں آنحضرت ؐ کی ذات باصفات کی بزرگی و عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں آپ کو رحمۃ للعالمین کے نام سے یاد کیا گیا ہے، ایک میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا اور فرشتے آپ پر درود بھیجتے ہیں۔ بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ جن میں آپ کے گناہوں سے درگزر کرنے کا ذکر ہے۔ یہ گناہ فی الحقیقت وہ ادنیٰ لغزشیں تھیں جو ایک بشر سے کبھی کبھی سرزد ہو جاتی ہیں۔

اتنی بڑی طاقت کا مالک ہونے کے باوجود آنحضرت ؐ کی زندگی نہایت سادہ تھی اور آپ ایک نیک منکسر مزاج شہری کی طرح رہتے تھے۔ اپنی وفات کے بعد آپ ایک ایسی اخلاقی وراثت چھوڑ گئے جس میں آپ کے تمام نام لیوا برابر کے شریک ہیں۔

اسلام قدیم عقیدۂ توحید کا احیا تھا۔ قرآن نے اسی کی تائید کی اور مسلمانوں کے لیے حکومت کے بنیادی اصول پیش کیے۔ اُدھر نبیؐ کا اُسوۂ حسنہ تھا جو عام زندگی میں لائحۂ عمل کا کام دینے لگا۔ آپ کے ارشادات کو آنے والی نسلوں نے ایک قیمتی یادگار سمجھ کر محفوظ کر لیا اور اُن سے زندگی کے عام اصول وضع کیے۔

آنحضرتؐ کی عزت و عظمت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی۔ چنانچہ اُن کی وفات پر اُنھیں بے حد قلق ہؤا اور اُن کے رنج و اندوہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ عوام کی اس بے تابی اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے قوم کے رہنماؤں نے مسلمانوں کی توجہ قرآن کی اُس آیت کی طرف مبذول کرائی جس میں کہا گیا ہے کہ پیغمبر بھی ماسوائے اس کے کہ اُن پر وحی ہوتی ہے، تمہاری طرح بشر ہیں اور اُن کا وفات پا جانا بھی تقاضائے بشریت ہی ہے۔ اس طرح کی آیات کئی ایک طرح بے حد مفید ثابت ہوئیں۔ انسانی فطرت کا کام صنم تراشی ہے۔ وہ ایسے بت بنا کر اُنھیں پوجنے کی عادی ہے۔ اگر قرآن پکار پکار کر یہ نہ کہتا کہ پیغمبر بھی تمہاری طرح بالکل ایک انسان ہے تو بہت ممکن تھا کہ لوگ اُنھیں بھی اپنا معبود بنا لیتے اور اُن کی پرستش کرنے لگ جاتے۔

اسلام کی سب سے بڑی جاذبیت اور اس کی مرکزی طاقت دو چیزوں میں مضمر ہے۔ ایسے شرعی اصول کہ جن پر انسان بآسانی کاربند ہو سکتا ہے اور ایسا اخلاقی نصب العین جس کا مقصد حقائق زندگی کا عرفان ہے۔ اور ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ اسلام کو اپنے استحکام اور تبلیغ و اشاعت کے ضمن میں کبھی کسی خارجی وسائل کی ضرورت نہ پڑی اور وہ دوسرے مذاہب کی طرح کسی کلیسیائی مشن یا نظام کا محتاج نہ ہؤا اور اُسے کبھی ایسے مبہم یا غیر ضروری ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی جن سے محض عوام کی جذب توجہ مقصود ہوتی ہے۔

خدا، انسان اور انسانی قلب کا اتحاد و امتزاج ایک زبردست طاقت ہے اور اسی طاقت سے اسلام کا وجود عمل میں آتا ہے اور اسی طاقت کے بل پر اسلام تمام روے زمین پر چھایا ہؤا ہے، جس روے زمین کو مسلمان ہمیشہ اپنی وارثت سمجھتے رہے ہیں۔ کیا قرآن صاف صاف یہ اعلان نہیں کرتا کہ ان الارض یرثھا عبادی الصلحون۔

مسلمانوں کی نظروں میں وہ مومن یہی نوواردان اسلام تھے، جنھوں نے خدا کے حضور میں اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا، جن کی روحیں اللہ کے نور سے منور تھیں اور جن کے سینوں میں اسی کا ظہور تھا۔

اسلام پھیلتا گیا اور قدیم مشرقی تہذیب و تمدن کے مٹتے ہوئے آثار کو اپنے دامن میں سمیٹتا چلا گیا۔ انھی آثار پر اسلامی تمدن کی بنیاد پڑی۔ جدید خیالات کی حیرت انگیز رنگینیوں سے اس تمدن کے خط و خال سنورتے چلے گئے اور رفتہ رفتہ ان کی رعنائیوں کا عکس یورپ پر پڑا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ کے صفحات ان فنا ناپذیر گل کاریوں سے مزین ہیں۔

تیرھویں صدی عیسوی میں یہ تمدن اپنے ارتقا کی انتہائی منزلیں طے کر رہا تھا کہ مشرق سے تاتاری حملوں کا تباہ کن سیلاب اُمڈ آیا اور اس کی تیز رو اس تہذیب کی زرخیز زمینوں کو بہا لے گئی اور تمدن کے وہ بیش بہا خزانے ایسے ڈوبے کہ پھر نہ ابھر سکے۔ مغرب میں اندلسی حکومت کو زوال آیا اور اس زوال کے ساتھ، ادبیات اور علوم و فنون کی سربفلک عمارتیں جو طلوع ہلال کے ساتھ ساتھ نمودار ہوئی تھیں، زمین پر آگریں۔ اسلامی دنیا کا شیرازہ بکھر گیا، سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی، خانہ جنگیوں اور باہمی خوں ریزیوں نے اس کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ افراد ملت میں پھوٹ پڑگئی، مسلمان نے مسلمان کا گلا گھونٹ دیا، ہر سمت تباہی اور بربادی چھا گئی۔ مشرق کی قدیم شرک آمیز بت پرستی نے پھر سر اُٹھایا۔ ایمان کی گردن ندامت سے جھک گئی۔ انسانی فسق و فجور نے زور پکڑا، اخلاق پست ہوگئے، مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑگئی، دین ایک رسمی شے بن گیا، دینداری کی جگہ تعصب نے لے لی۔

اس ابتری اور زوال کے عالم میں مسلمانوں کے اندر ایک نئی جماعت نے جنم لیا۔ یہ ایسے علما کی جماعت تھی جس نے عیسائی پادریوں کا منصب اختیار کرلیا۔ اس تحریک نے مذہب کو روایتی اور رسمی شے بنا دیا، انسانی فکر واجتہاد کی راہیں مسدود ہوگئیں، تحقیق وجستجو کی روح جسے اسلام نے آکر بیدار کیا تھا ایک بار پھر افسردہ پڑ گئی اور تھوڑے ھی عرصے میں علم و عرفان کا یہ ابلتا ہؤا چشمہ جمود کی نیند سو گیا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں مغربی حکومتوں کے فاتحانہ اقدامات تازیانوں کی طرح برسے اور ملت اسلامی نے پھر ایک بار آنکھ کھولی۔

سب سے پہلے بحیرۂ روم اور اس کے ساحلی علاقوں میں اسلامی ریاستوں کے اندر اسلامی بیداری کے آثار پیدا ہوئے اور انھوں نے سیاسی اور دینی احیا و اصلاح کی طرف قدم بڑھایا۔

اگرچہ اس نئی تحریک اور سولھویں صدی کی پروٹسٹنٹ تحریک میں کوئی بنیادی اشتراک نہ تھا تاہم اس کی صورت کم و بیش وھی تھی ، اس راہ میں قدم اٹھانے والی قوم جمھوریۂ ترکی تھی جس نے بڑھ کر خلافت کا خاتمہ کر دیا جو صدیوں سے دینی تفوق کا مرکز اور حکومت من جانب اللہ کی علمبردار سمجھی جاتی رھی تھی۔ اسی جذبے کے ماتحت علماء کے اس طبقے کو بھی دبا دیا گیا جو اس طرح کی حکومت و اقتدار کا آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔ اس خدائی حکومت کی بیخ و بنیاد کو اکھیڑنے کے لیے قدیم مدرسوں اور خانقاھوں کو بند کر دیا گیا جو دینی منصبداری اور شدید رجعت پسندی کا مرکز بن چکی تھیں۔ حکومت نے جسے اب محض دنیوی اقتدار حاصل تھا ، ان لوگوں کی جائدادیں ضبط کر لیں اور تمام مذھبی اداروں کو براہ راست اپنے قبضے میں لے لیا ، آن کا منصب اب فقط عبادت اور دینی رسوم کو ادا کرنا تھا۔ قرآن پاک کا ترجمہ ترکی زبان میں ھؤا اور وہ قومی لٹریچر کا جزو بن گیا۔

غرض بیسویں صدی میں اسلامی دنیا کے اندر ایک نئی صبح نمودار ھوئی۔ ھاں انسانی افکار کی تیزی یونھی واقعات کو اپنے ساتھ بہا لے جایا کرتی ھے۔

قرآن کا ارشاد ھے : اقرا وربک الاکرم ہ الذی علم بالقلم ہ علم الانسان مالم یعلم ہ قلم کی نوعیت اور انداز ھمیشہ بدلتا رھا ھے۔ کل کا انداز وہ نہ ھوگا جو کل تھا۔ فطرت ھر لحظہ ایک نئی تعمیر میں مصروف ھے ، ''کل یوم ھو فی شان'' زمانے میں عمل ارتقا جاری ھے۔ افق کا کبھی ایک رنگ نہیں ھوتا۔ ھر صبح اس میں تازہ گل کاریاں بھر دیتی ھے۔

انتہا